غالب اور کلکتہ

مرتبہ

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

غالب اور کلکتہ

مرتبہ:

شاہد ماہلی

GHALIB AUR KALKATTA

BY :

SHAHID MAHULI

I.S.B.N. - 81-8172-043-1

اہتمام	:	شاہد ماہلی
اشاعت	:	۲۰۱۰ء
قیمت	:	۱۰۰/روپے
مطبوعہ	:	اصیلا آفسٹ پریس، دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ـ ۲

www.ghalibinstitute.com-- email: ghalib@vsnl.net

پیش لفظ

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ہر سال کئی اہم قومی اور بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں ملک اور بیرونِ ملک کے بڑے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی کثیر تعداد شرکت کرتی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے اُن مقامات پر بھی سمینار منعقد کیے ہیں جن مقامات پر غالب کا قیام عمل میں آیا۔ کلکتہ، رام پور، بنارس، آگرہ اور الٰہ آباد وہ خاص شہر ہیں جہاں غالب نے اپنی عمر کے خاص ایام گزارے اور اُن شہروں کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ میں غالب کے علمی اور ادبی کارنامے آج بھی محفوظ ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی شروع ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ تمام شہر جہاں سے غالب کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے ہیں وہاں جا کر سمینار کیا جائے اور اُن شہروں کے تعلق سے غالب کی یادوں کو سمیٹ کر خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ اس مقصد میں ہم کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ کلکتہ، آگرہ، بنارس، رام پور اور الٰہ آباد میں ہم نے سمینار کا انعقاد کر کے غالب کی زندگی کے چند نئے گوشوں پر روشنی ڈالی۔ آگرہ، رام پور اور بنارس سے

متعلق مقالات کتابی شکل میں قارئین تک پہنچ چکے ہیں۔ 'غالب اور کلکتہ' کے عنوان سے یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ اہلِ علم اِس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ کلکتہ میں چند مہینوں کے قیام نے غالب کی زندگی پر کیسے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اِس کتاب میں شامل مقالات کے مطالعے سے ہمارے قارئین اس بات سے واقف ہوسکیں کہ غالب نے کلکتہ کا سفر کیوں کیا۔ کلکتہ جاتے وقت انہوں نے کن کن شہروں میں قیام کیا۔ کلکتہ میں انہیں کس طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کن کن لوگوں سے اُن کا ادبی معرکہ ہوا، ان تمام باتوں کی طرف اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اسلم پرویز، جناب ابوذر ہاشمی، ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر، ڈاکٹر عقیل احمد عقیل، اور دوسرے اہم نقادوں اور محققوں کے اس کتاب میں شامل نہایت ہی علمی مقالے ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔ اس موقع پر ہم شعبہ اردو کلکتہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے بھی شکرگزار ہیں جنہوں نے اس ادبی مذاکرے کے انعقاد میں ہمیں اپنا تعاون دیا۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب غالب شناسی میں ایک اہم اضافے کی حیثیت سے علمی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

شاہد ماہلی

فہرست

غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ

غالب ابھی نو سال ہی کے تھے جب اُن کے چچا نصر اللہ بیگ کی برطانوی فوج میں گھوڑے سے گر کر وفات ہوگئی، لارڈ لیک نے غالب، مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنوں کی ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کردی غالب اور اُن کے بھائی مرزا یوسف ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار سالانہ پنشن کے حقدار قرار پائے۔ لارڈ لیک نے پنشن پانے والوں کی فہرست میں خواجہ حاجی کو شامل کر کے اُن کے دو ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کردی۔ غالب کو اعتراض تھا چوں کہ خواجہ حاجی کا اُن کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے انھیں پنشن کا کوئی حق نہیں ہے غالب کی ساری زندگی پنشن حاصل کرنے یا پنشن کی رقم میں اضافہ کرانے کی جدو جہد اور اس سلسلے میں مقدمے بازی میں گزری۔

اس پنشن کی داستان بہت طویل ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ یہ بتانا ضروری ہے کہ غالبؔ کے چچا نصر اللہ بیگ خاں برطانوی فوج میں چار سو سوار کے رسالدار تھے اور سترہ سو روپے ماہانہ اُن کی تنخواہ تھی۔ بھرت پور کے قریب دو پرگنے سونک اور سونسا مرہٹے سردار ہلکر کے قبضے میں تھے۔ نصر اللہ بیگ خاں نے فوج کشی کر کے ان دونوں پرگنوں پر قبضہ کرلیا۔ یہ دونوں لاکھ سوا لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے زرخیز اور سیر حاصل پرگنے

تھے۔ لارڈ لیک نے نصراللہ بیگ خاں کی بہادری سے خوش ہو کر انھیں یہ دونوں پرگنے حینِ حیات مقرری جاگیر میں دے دیے۔ اتفاق سے نصراللہ بیگ خاں ہاتھی سے گر گئے۔ انھیں اتنی چوٹیں آئیں کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔ لارڈ لیک نے دونوں پرگنے واپس لے کر پس ماندگان کے لیے پنشن مقرر کر دی اور غالب کے سسر نواب الٰہی بخش کے بڑے بھائی نواب احمد بخش سے برطانوی سرکار نے یہ طے کیا کہ فیروزپور جھرکا اُن کی جاگیر رہے گی اور وہ پچیس ہزار سالانہ حکومت کو ادا کرتے رہیں گے۔ ۴رمئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک نے طے کیا کہ نواب احمد بخش خاں پچاس سواروں کا ایک دستہ رکھیں گے جس پر پندرہ ہزار روپے سالانہ خرچ کریں گے اور دس ہزار روپے سالانہ نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندگان کو وظیفے کے طور پر دیں گے۔ بقول غالبؔ نواب احمد بخش خاں نے پچاس سواروں کا دستہ تحلیل کر دیا اور دس ہزار روپے سالانہ وظیفے کی رقم گھٹا کر پانچ ہزار روپے سالانہ کر دی۔ مزید ستم یہ کیا کہ نصراللہ بیگ کے پس ماندگان میں اپنے ایک ملازم خواجہ حاجی کو بھی شامل کر دیا۔ پنشن کی تقسیم اس طرح کی گئی:

۱- خواجہ حاجی دو ہزار روپے سالانہ

۲- مرزا نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنیں ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ

۳- غالبؔ اور اُن کے بھائی مرزا یوسف ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ۔

(اس وقت غالبؔ کی عمر نو سال اور مرزا یوسف کی سات سال تھی)۔ جب غالبؔ نے ہوش سنبھالا تو انھیں اس بے ایمانی کا علم ہوا۔ اُن کا کہنا تھا کہ وظیفے کی رقم پانچ ہزار روپے سالانہ نہیں دس ہزار روپے سالانہ تھی نیز خواجہ حاجی کا اُن سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ خواجہ حاجی کے والد خواجہ مرزا، غالبؔ کے دادا کے باربردار تھے اور خواجہ حاجی اُن کے خانہ زاد تھے۔

نواب احمد بخش خاں کی اس ناانصافی کی وجہ سے زندگی بھر غالبؔ کو جو ذہنی اور جسمانی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، اُن کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

غالبؔ نواب احمد بخش خاں کو خط لکھ کر انصاف کا مطالبہ کرتے تھے۔ نواب صاحب وعدے تو کرتے رہتے تھے لیکن عملی طور پر اُنھوں نے کبھی کچھ نہیں کیا۔

مالک رام صاحب نے انڈیا آفس لائبریری سے غالبؔ کی ۲۸؍اپریل ۱۸۲۸ء کی جو

انگریزی عرض داشت دریافت کی تھی۔ اس میں یہ عبارت اس طرح ہے:

''تین برس بعد خواجہ حاجی کا جذام کے مرض سے انتقال ہوگیا۔''[1]

نواب احمد بخش خاں نے غالب سے کہا تھا کہ خواجہ حاجی کو جو دو ہزار روپے سال کا وظیفہ ملتا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ روپے تم کو ملا کریں گے۔ خواجہ حاجی کا انتقال ہونے کے بعد دو ہزار روپے سالانہ اُن کی اولاد کو ملنے شروع ہو گئے۔ غالب غصے میں نواب احمد بخش خاں کے پاس الور پہنچے۔ نواب صاحب فیروز پور گئے ہوئے تھے۔[1] چوں کہ الور کے معاملات (جن کی تفصیل آگے بیان کی گئی ہے) ۱۸۲۳ء میں ہوئے تھے، اس لیے خواجہ حاجی کا انتقال ۱۸۲۳ء کے آس پاس ہوا ہوگا۔ اگر ہم خواجہ حاجی کا سنہِ وفات ۱۸۲۳ء تسلیم کرلیں تو ہماری کئی مشکلات دور ہو جائیں گی۔

غالب نے سوچا کہ خواجہ حاجی کو حکومت سے دو ہزار روپے سالانہ پنشن مل رہی تھی۔ اب وہ دو ہزار روپے بھی انھیں ملنے چاہئیں۔

میرا خیال ہے کہ الور میں نواب احمد بخش خاں کا قیام اتنا طول پکڑ گیا کہ غالب کو دہلی واپس آنا پڑا۔

الور کے معاملات میں نواب احمد بخش خاں کو بہت دخل تھا۔ الور کے راجا اور راجا بختاور سنگھ نے انھیں ریاست کا وکیل بنا دیا تھا۔ راجا کے انتقال کے بعد راجا کے بیٹے بلونت سنگھ اور بھتیجے بنے سنگھ میں جانشینی پر اختلاف ہوا۔ ریاست میں نواب صاحب کے اقتدار سے بنے سنگھ کے حامی نواب صاحب سے ناخوش تھے۔ ان حامیوں نے نواب صاحب پر حملہ کر کے اُنھیں زخمی کر دیا۔

جب نواب احمد بخش کچھ صحت یاب ہوئے تو غالب پھر فیروز پور گئے اور اُنھوں نے نواب احمد بخش خاں سے کہا کہ 'خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب ہمیں، ہمارا حق ہمیں ملنا چاہیے، گورنر جنرل کے نام ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت میں غالب نے لکھا ہے کہ:

'اس طرح سے ایک زمانہ گزر جانے کے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے پیچھے دو بچے چھوڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ اس سال کی آمدنی مجھے ملے گی لیکن جب تنخواہ کی تقسیم ہوئی تو احمد بخش خاں کی ریاست سے دو ہزار روپیہ سالانہ کی رقم جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، فوراً خواجہ حاجی مرحوم کے بچوں کو ادا کر دی گئی۔'

''مایوسی کے عالم میں، میں احمد بخش خاں کے پاس فیروز پور گیا اور ان سے کہا کہ آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جو لوگ قانونی طور پر مستحق ہیں ان کے حقوق بحال کر دینے چاہئیں یا پھر مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا مقدمہ حکومت کے سامنے پیش کر دوں۔ میری اس بات پر وہ بستر سے اُٹھ بیٹھے، جس پر وہ زخمی ہو جانے کی وجہ سے لیٹے ہوئے تھے اور الور کی مختاری نکل جانے کے باعث بڑے دل شکستہ تھے۔ اُنھوں نے سسکیاں بھر بھر کر میرے سامنے رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے۔ برخوردار تم میرے بچے اور میری آنکھوں کا نور ہو، تم دیکھ رہے ہو کہ میں زخمی ہوں اور بے در بھی ہو چکا ہوں اور فریب سے مجھے اپنے واجبات سے محروم کر دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ جنرل آکٹر لونی سے نہ میری دوستی رہی ہے اور نہ پہلے جیسے پر تپاک مراسم۔ کچھ دن اور انتظار کر لو تمھارے تمام کے تمام حقوق بالآخر بحال کر دیے جائیں گے۔''

(فارسی سے ترجمہ)[۲]

غالبؔ پھر ناکام دلّی واپس آ گئے۔ بقول مالک رام:

''۱۵ر جولائی ۱۸۲۵ء کو دہلی کے ریذیڈنٹ آکٹر لونی کا میرٹھ میں انتقال ہو گیا اور ۲۶ر اگست ۱۸۲۵ء کو سر چارلس مٹکاف کا دہلی کے ریذیڈنٹ اور سول کمشنر اور گورنر جنرل کے ایجنٹ برائے راجپوتانہ کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ ان ہی دنوں بھرت پور کا معاملہ پیش آ گیا۔

بھرت پور کا قضیہ یہ تھا کہ ۱۸۲۳ء میں آکٹرلونی نے بلدیو سنگھ کو بھرت پور کا راجا بنا دیا تھا۔ چوں کہ بلدیو سنگھ ابھی نابالغ تھے، اس لیے اُن کے چچازاد بھائی ارجن سنگھ نے اُن کی مخالفت کی۔ آکٹرلونی نے بلدیو سنگھ کی مدد کے لیے دہلی سے کچھ فوج بھیج دی۔ گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ نے آکٹرلونی کا حکم منسوخ کرتے ہوئے بھرت پور بھیجی ہوئی فوج کو واپس بلالیا۔ آکٹرلونی کو گورنر جنرل کا یہ اقدام ناگوار گزرا اور اُنھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ جب چارلس مٹکاف ریذیڈنٹ مقرر ہوئے تو اُنھوں نے بھرت پور پر فوج کشی کے لیے گورنر جنرل کو راضی کرلیا۔ ۲۱/اکتوبر ۱۸۲۵ء کو مٹکاف کلکتے سے دہلی پہنچے۔ اوائل نومبر میں فصیل شہر کے باہر خیمے نصب کر کے بھرت پور پر فوج کشی کی تیاری شروع ہوئی۔ (Lord Comber Mere) کی کمان میں فوج لے کر مٹکاف مہم پر روانہ ہوئے۔ ۶/دسمبر ۱۸۲۵ء مٹکاف متھرا پہنچے۔ ۱۰/دسمبر کو بھرت پور کے قلعے کا محاصرہ کیا گیا اور ۱۸/دسمبر کو یہ معرکہ سر کرلیا گیا۔'' [۳]

اس مہم میں مٹکاف کے ساتھ نواب احمد بخش خاں بھی شامل تھے۔ نواب صاحب نے غالبؔ سے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ بھائی کی بیماری، مالی دشواری اور دوسری پریشانیوں کے باوجود پنشن کے معاملے میں انصاف کی اُمید پر غالبؔ ساتھ چلنے پر راضی ہو گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس مہم کے دوران انھیں چارلس مٹکاف سے ملاقات کا موقع مل جائے گا۔ مہم کے دوران غالبؔ نواب صاحب کے ساتھ رہے لیکن بھرت پور میں غالبؔ کے اِصرار کے باوجود نواب احمد بخش خاں نے چارلس مٹکاف سے اُن کی ملاقات نہیں کرائی۔ مٹکاف بھرت پور سے فیروز پور آ گئے، جہاں اُنھوں نے تین دن قیام کیا۔ غالبؔ نے اس دوران بھی بارہا نواب احمد بخش خاں سے درخواست کی لیکن نواب صاحب نے مٹکاف سے غالبؔ کی ملاقات نہیں کرائی۔

غالبؔ ۲۸ /اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت میں اس واقعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''موصوف (سر چارلس مٹکاف) کی آمد کے بعد چوں کہ بھرت پور کا معاملہ ان کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور وہ راجا کی امداد اور بھرت پور میں باغیوں کی گوشمالی کی جانب اپنی ساری توجہ مبذول کیے ہوئے تھے، اس لیے احمد بخش خاں نے کہا کہ مجھے اس سفر میں ان کے ساتھ جانا چاہیے باوجودیکہ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کی علالت[8] اور قرض خواہوں کے سخت تقاضوں کی وجہ سے اذیت ناک پریشانی میں مبتلا تھا اور بالکل اس سفر کے قابل نہیں تھا لیکن اس اُمید پر کہ موصوف (سر چارلس مٹکاف) کی طرف سے جو فرضِ منصبی مجھ پر عائد ہوتا ہے وہ ادا ہو جائے گا۔ میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہذیانی حالت میں چھوڑا، چار آدمی اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت پر مقرر کیے، کچھ قرض خواہوں سے وعدے وعید کر کے انھیں راضی کیا، دوسروں سے چھپتا چھپاتا اور بھیس بدل کر کسی قسم کی سہولت کے بغیر بمشکل تمام احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور روانہ ہو گیا۔''[۹]

اس زمانے میں غالبؔ کے بھائی مرزا یوسف دماغی عارضے میں مبتلا تھا۔ ان کی دیکھ بھال پر غالبؔ کو چھ سو روپے سالانہ خرچ کرنے پڑتے تھے۔ پنشن میں سے غالبؔ کے پاس صرف نو سو روپے بچ رہتے تھے، جس کا بیشتر حصہ قرض خواہوں کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

جب چارلس مٹکاف سے جلد ملاقات کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی تو غالبؔ نے پنشن کے معاملے میں نواب احمد بخش خاں کے وسیلے اور اِعانت کا خیال ترک کر دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ بغیر کسی ذریعے کے مٹکاف سے ملاقات کریں گے۔ اُس وقت مٹکاف دہلی میں تھے اور قرض خواہوں کے خوف سے غالبؔ دہلی نہیں جا سکتے تھے۔ اس لیے یہ موقع بھی غالبؔ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان ہی دنوں خبر ملی کہ گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ کان پور کے راستے دہلی آ رہے ہیں۔ چوں کہ اس کا پورا اِمکان تھا کہ سر چارلس مٹکاف، لارڈ ایمہرسٹ کے

استقبال کے لیے کان پور پہنچیں گے اور وہاں سے دہلی تک گورنر جنرل کے ہم رکاب رہیں گے۔ اس لیے غالبؔ نے سوچا کہ وہ کان پور پہنچ جائیں اور گورنر کے جلوس کے ساتھ دہلی واپس آئیں۔ راستے میں انھیں چارلس مٹکاف سے اپنی پنشن کے حالات، اپنی عُسرت و تنگ دستی کی ذلّت بھری داستان اور قرض خواہوں کے احوال بیان کرنے کا موقع مل جائے گا۔

مالک رام صاحب نے غالبؔ کی ۲۸؍اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں غالبؔ کا بیان ہے کہ اُنھوں نے نواب احمد بخش خاں سے کہا کہ:

''آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جائز وارثوں کو اُن کا حق دینا چاہیے یا پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں جا کر اپنا مطالبہ حکومتِ عالیہ کے سامنے پیش کروں۔[۵]

اس انگریزی عبارت کا ترجمہ غالبؔ کی خاندانی پنشن میں 'حکومتِ عالیہ' کے بجائے 'حکومت' کیا گیا ہے[۱۱] اور حکومت سے مراد دہلی کے ریذیڈنٹ ہیں۔ غالبؔ کی پوری کوشش تھی کہ وہ اپنی شکایت ریذیڈنٹ چارلس مٹکاف تک پہنچائیں۔ جب گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ کی کان پور پہنچنے کی خبر آئی تو غالبؔ کو خیال ہوا کہ نواب احمد بخش خاں کو بیچ میں ڈالے بغیر چارلس مٹکاف سے براہِ راست گفتگو کریں۔ اُنھوں نے سوچا کہ جب وہ دہلی آئیں گے تو غالبؔ بھی اُن کے ساتھ واپس آجائیں گے اور راستے میں اُن سے اپنی شکایت کرنے کا موقع نکال لیں گے۔

اُنھوں نے ۲۸؍اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت میں لکھا ہے کہ:

''بہتر یہ ہے کہ کسی اور کو بیچ میں ڈالے بغیر میں خود سر چارلس مٹکاف سے ملوں اور اپنا سارا احوال شروع سے آخر تک، بلا کم و کاست ان کی خدمت میں پیش کروں تاہم قرض خواہوں کے تقاضوں کے خوف نے میرے لیے یہ ناممکن بنا دیا کہ میں دہلی جاؤں۔ اس خیال سے کہ میری نیک نامی کو بٹّہ نہ لگ جائے میں نے یہ ارادہ

ترک کر دیا۔ اس کے علاوہ ان ہی دنوں گورنر جنرل کی آمد کی خبر عام ہوئی اور امکان یہ تھا کہ سر چارلس مٹکاف، گورنر جنرل کی ہم رکابی کے لیے تشریف لائیں گے تو میرے دل میں کان پور جانے اور وہاں سے ان کے خدم و حشم کے جلوس کے ساتھ واپس آنے اور راستے میں خود کو سر چارلس مٹکاف سے متعارف کرانے، اپنی عسرت و تنگ دستی کی ذلت بھری داستان بے چارگی اور قرض کے احوال ان کے گوش گزار کرنے اور انصاف حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس ارادے کے ساتھ میں فیروز پور سے فرخ آباد اور کان پور کی جانب روانہ ہوا۔"[5] (الف)

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ غالبؔ 'حکومت' یعنی ریذیڈنٹ سے شکایت کرنا چاہتے تھے۔ 'حکومتِ عالیہ' یعنی جرنل سے نہیں۔ کان پور سے روانہ ہونے سے پہلے اُنھوں نے قطعی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کلکتے جا کر شکایت کریں۔
یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میرا خیال ہے کہ غالبؔ نے جب کان پور جا کر گورنر جنرل اور چارلس مٹکاف کے ساتھ دہلی واپس آنے کا ارادہ کیا ہے تو وہ سفرِ خرچ کے انتظام کے لیے دہلی گئے۔ اُنھوں نے ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت میں لکھا ہے کہ:

"بالآخر ضرورت سے مجبور ہو کر میں دہلی گیا جو میرے آبا وَ اجداد کا زاد بوم ہے، یہاں میں نے اپنے نانا اور والد کے تمام اثاثے جو میرے پاس بچ رہے تھے، بیچ ڈالے اور قرض خواہوں سے قرض چکانے کے لیے رابطہ قائم کیا اور اس آمدنی سے قرض چکانے کے باوجود اس وقت بھی میں بیس ہزار روپے کا مقروض ہوں۔"[6]

غالبؔ نے اپنے نانا اور والد کا اثاثہ فروخت کیا۔ اس طرح جو رقم ملی، اس سے کچھ قرض چکایا اور کان پور تک کے سفر خرچ اور اس شہر میں قیام کے لیے کچھ رقم لے کر فیروز پور واپس

آ گئے اور پھر وہاں سے فرخ آباد ہوتے ہوئے کان پور پہنچ گئے۔

غالبؔ کے بعض محققین کا خیال ہے کہ غالبؔ دہلی ہی سے کلکتے کے سفر کا ارادہ کر کے چلے تھے۔ غالبؔ نے مولوی فضل حق خیر آبادی کے نام جو خط لکھا تھا اس کے تعارف کے طور پر اُنھوں نے چند سطریں نواب محمد علی خاں کو لکھی تھیں:

"سوادِ نخستین نامہ ایست شرحش ایں کہ درمیاوی بسیجِ سفرِ مشرق، بہ فیروز پور کہ جا گیرِ عمو صاحب قبلہ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ است، بخدمتِ عمِ ممدوح گزرانیدہ بودم۔"[۷]

پہلے خط کا مفہوم یہ ہے کہ مشرق (کلکتے) کے سفر سے پہلے میں اپنے چچا فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم کی جاگیر (فیروز پور) میں مقیم تھا۔

خط کی تعارفی تحریر میں غالبؔ کے ان الفاظ سے کہ 'سفرِ مشرق (کلکتہ) کی تیاری کی ابتدا میں جب میں فیروز پور میں مقیم تھا' سے بعض محققین نے یہ مطلب نکالا ہے کہ غالبؔ نے جب مولوی فضل حق خیر آبادی کو خط لکھا ہے اُس وقت وہ کلکتہ جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ مجھے محققین کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ کیوں کہ مولوی فضل حق کے خط میں غالبؔ نے یہ بتایا ہے کہ نواب احمد بخش خاں الور کے معاملات میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ممکن ہے یہ معاملات اس زمانے کے ہوں جب بنّے سنگھ اور بلونت سنگھ کے اختلافات دور کرنے میں نواب صاحب مصروف تھے۔ ایک بات ضرور ہے کہ الور کے ایک شخص نے نواب احمد بخش پر ۲ رمئی ۱۸۲۳ء کو قاتلانہ حملہ کر کے انھیں زخمی کر دیا تھا۔ غالبؔ کا یہ خط اس واقعے سے پہلے کا ہے، ورنہ غالبؔ قاتلانہ حملے کا ذکر ضرور کرتے۔ اب رہا سوال غالبؔ کی تحریر کے یہ الفاظ 'درمبادیِ بسیجِ سفرِ مشرق'۔ غالبؔ نے یہ الفاظ مولوی فضلِ حق خیر آبادی کے خط کے تعارف میں ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۹ء میں لکھے تھے اور یہ الفاظ بعد میں لکھے گئے ہوں گے خط کے ساتھ نہیں۔ مولوی صاحب کے نام خط میں نہیں اس لیے غالبؔ کے دہلی سے فیروز آباد کے

دو یا تین سفروں کو کلکتے کے سفر کا آغاز ہی کہیں گے۔

غالبؔ کان پور اور لکھنؤ میں

چارلس مٹکاف سے ملاقات کے لیے غالبؔ کان پور پہنچ گئے۔ کان پور پہنچتے ہی بیمار پڑ گئے۔ بقول غالبؔ:

''اتفاق دیکھیے کہ کان پور پہنچتے ہی میں بیمار پڑ گیا۔ اچانک نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہلنے جلنے کی طاقت بھی جاتی رہی۔ چوں کہ مجھے اس شہر میں کوئی مناسب طبیب نہ مل سکا ہے[1] اس لیے مجبوراً دریاے گنگا کو عبور کر کے کرایے کی ایک فینس میں مجھے لکھنؤ کی راہ لینی پڑی۔ میں لکھنؤ میں پانچ مہینے اور چند روز صاحبِ فراش رہا۔''[2]

غالبؔ کے بیانات سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے لکھنؤ میں پانچ مہینے قیام کیا تھا۔ ایک تو وہ بیان جو اُنھوں نے گورنر جنرل کے نام عرض داشت مورخہ ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء میں دیا تھا، جس کا اقتباس پہلے نقل کر دیا گیا ہے اور دوسرے ابن حسن خاں کے نام ایک فارسی خط میں غالبؔ نے لکھا ہے:

''کما بیش پنج ماہ دراں شہر آب خورد کردہ۔''[3]

راے چھج مل کے نام غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے:

''۲۶/ذیقعدہ بروز جمعہ اس ستم آباد (لکھنؤ) سے نکل کر ۲۹/تاریخ کو دارالسرور کان پور پہنچا۔ دو تین مقامات سے گزرتا ہوا آخر کار باندہ پہنچ جاؤں گا۔ اگر خدا نے چاہا اور موت نے امان دی تو کچھ دن آرام کر کے کلکتے کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔''[4] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ خط کے متن میں جو تاریخیں لکھتے ہیں، اُن میں عام طور سے سنین نہیں لکھتے۔ اس خط میں بھی یہی ہوا ہے۔ اُنھوں نے تاریخ اور مہینہ تو لکھا ہے لیکن سن نہیں لکھا۔ مختارالدین احمد

اور دوسرے محققین کا خیال ہے کہ یہ سنہ ۱۲۴۲ء یعنی ۱۸۲۷ء ہے۔ مجھے محققین کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ غالبؔ ۲۶ رذیقعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۲ رجون ۱۸۲۷ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ جب گورنر جنرل ایمہرسٹ کان پور پہنچے اور شاہِ اودھ غازی الدین حیدر اُن سے ملاقات کے لیے کانپور گئے تو غالبؔ لکھنؤ میں تھے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ "میں نے گورنر جنرل کی آمد کی خوش کن خبر سنی اور آنجناب سے ملاقات کے لیے شاہِ اودھ کا حال سنا۔"[۵]

یہ واقعہ ۲۰ رنومبر ۱۸۲۶ء کا ہے۔

اگر ہم غالبؔ کے اس بیان کو درست مان لیں کہ لکھنؤ میں اُن کا قیام پانچ مہینے یا پانچ مہینے سے دو چار دن سے زیادہ رہا تو غالبؔ کو دسمبر ۱۸۲۶ء یا جنوری ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ پہنچنا چاہیے مگر یہ تاریخیں تسلیم کرنے میں قباحت یہ ہے کہ ۲۰ رنومبر ۱۸۲۶ء (شاہِ اودھ اور گورنر جنرل کی کان پور میں ملاقات کی تاریخ) کو غالبؔ لکھنؤ میں تھے۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ غالبؔ نومبر کے مہینے میں لکھنؤ پہنچ چکے تھے تو لکھنؤ میں غالبؔ کے قیام کو کم سے کم آٹھ مہینے ہو جاتے ہیں۔ اِمکان یہ ہے کہ وہ نومبر سے ایک دو مہینے پہلے پہنچے ہوں گے۔ اگر ہمارا قیاس درست ہے تو غالبؔ پانچ مہینے سے آٹھ نو مہینے تک لکھنؤ میں رہے تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اُن کا قیام اور بھی زیادہ مدت کے لیے رہا ہو۔

غالبؔ نے معتمد الدولہ کی مدح میں ایک سو دس اشعار کا ایک قصیدہ بھی کہا تھا۔ قصیدے کا مطلع ہے:

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم
ہوسِ زلفِ ترا سلسلہ جنباں رفتم

چوں کہ معتمد الدولہ نے ملاقات کے لیے غالبؔ کی شرائط منظور نہیں کی تھیں، جس کی وجہ سے غالبؔ اُن سے ناراض ہو گئے تھے، اس لیے غالبؔ نے معتمد الدولہ کے لیے جو عرض

داشت لکھی تھی، وہ انھیں پیش نہیں کی اس کی تعارفی تحریر میں غالبؔ نے معتمد الدولہ کو 'نو دولتیہ' کہا۔ اسی طرح معتمد الدولہ کو یہ قصیدہ بھی پیش نہیں کیا۔
غالبؔ جب باندے گئے تو اُنھوں نے نواب محمد علی خاں کو اس قصیدے کی نقل پیش کی۔ کلکتے پہنچ کر انھیں خیال آیا کہ اس قصیدے پر ممدوح کی حیثیت سے معتمد الدولہ کا نام ہے۔ چوں کہ غالبؔ ممدوح کا نام بدلنا چاہتے تھے۔ انھیں خیال آیا کہ اگر نواب محمد علی خاں نے کسی کو دکھایا دیا تو یہ قصیدہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لیے کلکتے پہنچ کر غالبؔ نے نواب صاحب کے نام ایک خط میں لکھا:

''......خدا گواہ ہے وہ قصیدہ جو میں نے آغا میر کی مدح میں لکھا ہے، میرے خاندان کے لیے باعثِ رسوائی ہے۔ اب لطف یہ ہے کہ قصیدے کے ان اشعار کو کاغذ سے مٹا نہیں سکتا۔ نواب مرشد آباد بھی سیّد زادے ہیں۔ اس قصیدے کو اُن کے نام سے مشہور کر رہا ہوں۔ اگر چہ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا لیکن ہمایوں جاہ کی مدح مجھے ناگوار نہیں ہے۔ جب تک اس قصیدے کے ممدوح سے مختص اشعار شامل نہ کر لوں۔ یہ اشعار کسی کو نہ دکھائیں اور بزرگوں کی طرح چھوٹوں کے عیب پوشیدہ رکھیں۔'' ۵ الف

غالبؔ معتمد الدولہ آغا میر سے اتنے ناراض تھے کہ اس سے بھی انکار کر دیا کہ اُنھوں نے معتمد الدولہ کی مدح میں قصیدہ کہا تھا۔ قاضی عبد الودود نے لکھا ہے کہ:

''غالبؔ نے کہیں لکھا ہے کہ اُنھوں نے آغا میر کی مدح میں قصیدہ نہیں لکھا، صرف نثر لکھی تھی۔ اس مجموعے کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ ایک سو دس ابیات میں اُن کا نام بھی آیا تھا۔ اُس کی ایک نقل محمد علی خاں کے پاس تھی۔ غالبؔ اُنھیں لکھتے ہیں کہ یہ قصیدہ میرے خاندان کے لیے باعثِ ننگ ہے لیکن اسے ضائع بھی نہیں کر سکتا۔ ابھی تک ہمایوں جاہ نواب مرشد آباد سے ملاقات کا موقع

نہیں ملا مگر چاہتا ہوں کہ اُن کے نام کردوں۔ جب تک وہ اشعار جن میں آغا میر کا نام آیا ہے یا اُن کی طرف اشارہ ہے بدل نہ دوں، یہ قصیدہ کسی کو نہ دکھائیں۔ بعد کو اُس قصیدے کے ممدوح نصیرالدین حیدر قرار پائے۔ اُس کی ردیف 'رفتم' ہے اور قوانی 'عنوان'، 'گریبان' وغیرہ ہیں۔'' [6]

بعد میں غالبؔ نے اس قصیدے [10] کا ممدوح شاہِ اودھ نصیرالدین حیدر کو کردیا۔ ایک سو دس اشعار کا یہ قصیدہ کلیاتِ غالب فارسی میں شامل ہے۔ [7]

غالبؔ نے لکھنؤ میں گیارہ اشعار کی ایک غزل کہی تھی۔ اس کے آخری تین شعر تھے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے، یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لائی ہے معتمدالدولہ بہادر کی امید
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

جب معتمدالدولہ سے بگڑ گئی تو آخری شعر کے پہلے مصرع سے معتمدالدولہ کا نام نکال کر اسے مقطع کردیا۔ متداول دیوان میں اب یہ شعر اس طرح ملتا ہے:

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

لکھنؤ کے حالات بہت زیادہ خراب تھے۔ غالبؔ کا خیال تھا کہ یہ خرابی معتمدالدولہ کی وجہ سے تھی، جنھوں نے بقول غالبؔ 'عوام پر ظلم وستم کی حد کر رکھی تھی۔ غالبؔ نے اپنے دوست رائے چھج مل کو وہاں کے حالات تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

غالبؔ ۲۶/ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۱/جون ۱۸۲۷ء بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ

ہوئے۔ چوتھے دن کان پور پہنچے۔ کچھ دن آرام کر کے وہ کلکتے کے ارادے سے باندہ روانہ ہو گئے۔ غالبؔ نے کلکتے جانے کا ارادہ لکھنؤ میں اُس وقت کرلیا تھا جب وہ چارلس مٹکاف سے ملاقات میں ناکام ہو گئے تھے۔

غالبؔ کا باندہ، الہ آباد، بنارس اور مرشد آباد کا سفر

غالبؔ کے سفرِ باندہ اور قیام باندہ پر محمد مشتاق شارقؔ کا ایک مقالہ[1] اور صالحہ بیگم قریشی کی ایک کتاب[2] چھپی ہے۔ اس کتاب اور مضمون میں پہلی بار غالبؔ اور باندے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ میں نے یہاں اس مضمون اور کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ لکھنؤ ہی میں غالبؔ نے کلکتے کے سفر کا ارادہ کرلیا تھا۔ انھیں خیال تھا کہ معتمد الدولہ اور شاہِ اودھ غازی الدین حیدر سے انعام و اکرام کی صورت میں اتنی رقم مل جائے گی کہ وہ لکھنؤ سے کلکتے کا سفر کرسکیں گے۔ جب معتمد الدولہ نے اُن کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تو اُنھوں نے سوچا کہ وہ لکھنؤ سے کان پور اور کان پور سے باندہ جائیں۔

غالبؔ نے نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفقؔ کے نام ایک خط مورخہ ۱۸۵۳ء میں لکھا ہے:

"میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسندِ نشین حال (نواب ذوالفقار علی بہادر) کا چچا تھا اور میرا ہمشیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی کا اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔ وہ باعث ہوا تھا میرے باندہ بوندیل کھنڈ آنے کا۔"[3]

غالبؔ کو امید تھی کہ باندے میں نواب ذوالفقار علی بہادر اُن کا علاج کرادیں گے، نیز ان کے کلکتے کے سفر کے لیے اخراجات کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

باندہ اتر پردیش کے جنوب میں بندیل کھنڈ میں واقع ہے۔ یہ شہر باندہ ضلع کا صدر مقام ہے۔ اس شہر کا جغرافیہ بتاتے ہوئے صالحہ بیگم قریشی نے لکھا ہے:

''(باندے) کے شمال میں دریائے جمنا۔ مشرق میں الہ آباد کا ضلع، جنوب میں بندھیاچل پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ و موجودہ مدھیہ پردیش کا علاقہ۔ اور مغرب میں دریائے کین اور ہمیر پور کا ضلع واقع ہے۔ یہ شہر قدیم قومی شاہراہ گرانڈ ٹرنک روڈ سے کافی دور اور بندیل کھنڈ کے اندرونی حصّے میں ہے۔ اس لیے یہ ضلع تمام سمتوں سے کٹ کر گمنام سا ہو گیا تھا۔''[4]

غالبؔ ۲۱ر جون ۱۸۲۷ء کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر غالباً تیسرے دن کان پور پہنچے۔ یہاں سے اُنھوں نے فتح پور تک کا غالباً یکّے کے ذریعے سفر کیا۔[5] کان پور سے چار پانچ دن کا سفر طے کر کے غالبؔ جون ۱۸۲۷ء کے اواخر یا جولائی کے شروع میں باندے پہنچ گئے۔

غالبؔ نے باندے جانے کے بارے میں گورنر جنرل کو پیش کی جانے والی عرض داشت میں لکھا ہے:

''چوں کہ میرے اور نواب ذوالفقار علی بہادر کے آبا و اجداد میں دوستانہ مراسم زمانۂ قدیم سے چلے آ رہے تھے اور میرے دل میں بھی نواب بہادر کے لیے بڑی محبت اور لگاؤ تھا، اس لیے میں نے ایسی تدبیریں شروع کر دیں کہ جس طرح بھی بن پڑے میں بندیل کھنڈ میں باندے پہنچ جاؤں۔ میں وہاں نواب صاحب کے دولت کدے پر چھے مہینے تک مقیم رہا۔''[6]

جب غالبؔ باندے پہنچے ہیں تو اُن کی طبیعت بہت خراب تھی۔ نواب ذوالفقار علی بہادر نے غالبؔ کا علاج کرایا۔ غالبؔ نے لکھا ہے:

''اللہ کے فضل اور نواب صاحب کی توجہ اور تیمارداری کی بدولت مجھے اس خطرناک بیماری سے شفا حاصل ہوئی۔''[7]

غالبؔ کو کان پور میں جو بیماری ہوئی تھی، جس سے انھیں لکھنؤ میں اور پھر باندہ میں بھی نجات نہیں ملی۔ اس کے بارے میں بھی صالحہ بیگم قریشی نے باندہ میں کہی گئی غالبؔ کی غزل

جس کا مطلع ہے:

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

کا تجزیہ کر کے قیاس کیا ہے کہ غالبؔ 'بوالدم' کے مریض تھے۔ اس میں پیشاب کے ساتھ قطرہ قطرہ خون آتا ہے۔ "جب خون آتا ہے تو بے حد سوزش اور جلن کا احساس ہوتا ہے، جس سے تکلیف بڑھتی ہے.......... یہ مرض 'بوالدم' کثرتِ شرابِ نوشی یا کسی دیگر وجہ سے گردوں میں حدّت بڑھ جانے کی وجہ سے لاحق ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے گردوں میں پتھری پڑ گئی ہو۔"[8] صالحہ کا قیاس ہے کہ غالبؔ کا علاج حکیم کرامت حسین نے کیا تھا۔

نواب ذوالفقار علی بہادر کے محلات کو انگریزوں نے اُس وقت ڈھا دیا تھا جب اُنھوں نے ۱۸۵۸ء میں شہر باندہ پر دوبارہ قبضہ کیا لیکن وہ عمارت محفوظ ہے۔ جو نواب صاحب کا مہمان خانہ تھا جو بقول صالحہ بیگم قریشی 'آج بھی شکستہ حالت میں موجود ہے اور جسے بارہ دری کہتے ہیں اور جس سے ملحق عمارت میں شہر کی نگر پالیکا کے دفاتر واقع ہیں۔'[9] اسی مہمان خانے میں غالبؔ نے چھ مہینے قیام کیا ہوگا۔

باندے میں غالبؔ کے ایک رشتہ دار مرزا اوزبک خاں بھی تھے۔ یہ نواب باندہ اور غالبؔ دونوں کے ہمشیر تھے اور غالبؔ کی ممانی کے صاحب زادے تھے۔ مرزا اوزبک خاں کے بڑے بھائی مرزا مغل خاں بھی باندے میں تھے۔

باندے میں ایک صاحب نواب محمد علی خاں تھے جو اس زمانے میں باندے کے صدر امین (سول جج تھے) یہ فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان سے بھی غالبؔ کے بہت گہرے دوستانہ مراسم ہو گئے۔ کلکتے میں جب غالبؔ مالی مشکلات کا سامنا کر رہے تھے تو محمد علی خاں صاحب نے اُن کی مالی مدد کی، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ غالبؔ نے کلکتے سے نواب محمد علی خاں کے نام جو خطوط لکھے ہیں اور جنھیں سید اکبر علی ترمذی نے 'نامہ ہائے فارسی غالب'

کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ غالبؔ کے سفرِ کلکتہ اور قیام کلکتہ کے حالات کے سلسلے میں اہم ترین مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ باندے سے کلکتے کے لیے خاصی بڑی رقم کی ضرورت تھی اور غالبؔ کے پاس کچھ نہیں تھا۔ بقول غالبؔ:

"جب باندہ پہنچا تو میں نے نواب صاحب سے دو ہزار روپے قرض مانگے ...... میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی غنیمت ہے۔ یہ روپے لو اور یہاں سے چلو۔"[10]

نواب ذوالفقار علی خاں نے اپنے مہاجن سیٹھ امی کرن سے دو ہزار روپے قرض دلوا دیے۔ ان مہاجن کا نام کئی محققین نے سیٹھ امین چند بتایا ہے جو درست نہیں (اس کتاب کے آخر میں ان کے حالات دیے گئے ہیں) غالبؔ کو باندے سے الہ آباد جانا تھا۔ اُن کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ باندہ سے چلہ تارہ، وہاں سے فتح پور، پھر الہ آباد جائیں۔ یہ خشکی کا راستہ تھا۔ اس راستے پر سفر کے لیے گھوڑوں یا گاڑیوں کا استعمال کرنا پڑتا تھا دوسرا راستہ تھا۔ باندہ سے چلہ تارہ اور وہاں سے باقی سفر بذریعہ ناؤ۔

باندہ میں چھ مہینے گزار کر صحت یاب ہو کر اور نواب ذوالفقار علی خاں کے مہاجن امی کرن سے دو ہزار روپے لے کر اور زادِ سفر سے لیس غالبؔ کلکتے کے سفر پر روانہ ہوئے۔

غالب نے محمد علی خاں کو دو خطوط میں باندہ سے الہ آباد کے سفر کے حالات لکھے ہیں۔ باندہ سے نکل کر غالبؔ کی پہلی منزل مودھا تھی۔ غالبؔ لکھتے ہیں:-

"جمعرات کے دن مودھا پہنچا۔ اتوار تک آرام کیا اور بروز پیر سفر پر روانہ ہو گیا۔ رات ایک گاؤں میں گزاری۔ منگل کو چلہ تارا پہنچا۔ للہ الحمد۔ بخار اتر گیا اور سر کا درد بھی باقی نہیں رہا۔ آج کی رات چلہ تارا میں گزاروں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بخار اور دردِ سر نہیں رہا۔ اگر زندگی باقی ہے تو کل صبح فتح پور تک کا راستہ طے کروں گا۔"[11]

غالبؔ نے ایک اور خط میں نواب محمد علی خاں کو لکھا ہے:

" قبلۂ جان و دل سلامت، آداب کورنش کے بعد اپنا حال بیان کرتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ دردِ سر اور بخار جو باندہ تک ساتھ تھا، اب اُس سے نجات مل گئی ہے۔ کچھ کمزوری باقی ہے، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ جب دہلی سے روانہ ہوا تھا تو یہ دونوں مرض لاحق تھے۔ پورے سفر میں ان امراض سے نجات نہیں ملی...... مختصر یہ کہ میں پیر کو مودھا سے روانہ ہوا۔ ایک چھکڑا، جسے اس علاقے میں لڑھیا کہتے ہیں، سامان لے جانے کے لیے کرائے پر لیا۔ یہ چھکڑا تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور و ضعیف نکلا۔ آہستہ خرام بلکہ مخرام کی حالت تھی۔ بارہ کوس کا سفر بھی طے نہ کرسکا۔ (دن بھر میں) مودھا سے چلّہ تارہ تک نہ پہنچ سکا۔ مجبوراً راستے میں ایک گاؤں میں رات گزارنی پڑی۔ منگل کی آخرِ شب روانہ ہوا اور دوپہر کو چلّہ تارہ پہنچا۔ (اور یہ چھکڑہ) جس کی حالت ہیچ مخرام کی تھی، رات کا ایک پہر گزرنے ہی پر مجھ تک پہنچا۔ ملازموں نے ابھی چراغ روشن نہیں کیے تھے۔ میں نے رات کے اندھیرے میں خط لکھا۔ چوں کہ باندے میں مرزا مغل نے فرمایا تھا کہ مولوی صاحب (نواب محمد علی) کے نام کا خط چلّہ تارا کے تھانے دار کو دے دوں، وہ پہنچا دیں گے۔ اتفاق سے میں چلّہ تارا کے کارواں سرائے میں آخر روز بلکہ اوّل شب لڑھیے اور اُس کے ساتھ آنے والے لوگوں کا انتظار کررہا تھا کہ ناگاہ تھانے دار کارواں سرائے میں آگیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا۔ میں نے ارسالِ خط کے سلسلے میں اُس سے مدد مانگی۔ اگرچہ اُس نے (میری درخواست) قبول کرلی لیکن ایسے کمینے پن کے انداز کے ساتھ کہ اگر وہ (میری درخواست) قبول نہ کرتا تو بہتر ہوتا۔

چناں چہ دل نہ مانا اور میں نے اُسے خط دینا گوارا نہ کیا۔ جب ایک مسافر نے، جن کے حالات سے میں واقف نہیں، مجھ سے آپ کا نام سنا تو بڑی عاجزی وانکساری سے وہ خط مجھ سے مانگا۔ وہی چند سطریں جو میں نے جلدی میں اندھیرے میں لکھی تھیں، اُن کے سپرد کر دیں لیکن اگر اُس اطاعت نامے کے پہنچنے کی حالت بھی وہی ہے، جو اس چھکڑے کی ہے تو پھر یہ خط باندہ اُسی وقت پہنچے گا، جب میں (یہ عاصی) کلکتے پہنچوں گا۔ اس سے کم وقت میں اس خط کا چلّہ تارا سے باندہ پہنچنا ممکن نہیں۔ **واللہ علیٰ کُلِّ شئٍ قدیر۔**

مختصر یہ کہ گردونِ دوں (گردوں چھکڑے اور آسمان دونوں کو کہتے ہیں) کے ظلم وستم سے تنگ آ کر میں نے خود کو دریا میں ڈال دیا یعنی اس مقام سے میں نے کشتی کرائے پر لی۔ تمام سامان گھوڑے اور ساتھ چلنے والے لوگوں کو کشتی میں بھر کر بسم اللہ، مجریہا ومرسہا پڑھ کر دریائے جمنا میں سفر کر رہا ہوں۔ میں بنارس میں جو وقت گزارنا چاہتا تھا اب ارادہ ہے کہ وہ الہ آباد میں گزاروں۔ یہاں چند روز آرام کر کے ضروری سامان فراہم کرنے کے بعد آگے کا سفر شروع کر دوں اور پھر مرشد آباد اور بنگال کے سوا کہیں اور قیام نہ کروں۔ دریا کے سفر کا حال دو تین دن میں معلوم ہو جائے گا۔ کشتی بان کہتے ہیں کہ تین دن میں الہ آباد پہنچ جائیں گے، دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ آج چہار شنبہ ہے، آدھا دن گزر چکا ہے۔ کشتی میں بیٹھا ہوا، ناخدا سے نہیں، خدا سے دل لگائے ہوئے ہوں۔ زیادہ حدِ ادب۔"[۱۲]

کشتی بانوں نے غالبؔ کو یقین دلایا تھا کہ تین دن میں الہ آباد پہنچ جائیں گے لیکن یہ کشتی ۲۷ رنومبر بروز منگل الہ آباد پہنچی۔

اوپر جو خط نقل کیا گیا ہے، اس میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ وہ بنارس میں جو دن گزارنا چاہتے تھے، اب الہ آباد میں گزاریں گے۔ اس شہر سے ضروری سامان فراہم کر کے آگے کے سفر پر نکلیں گے۔ غرض یہ ہے کہ غالبؔ کشتی کے ذریعے چلّہ تارا سے روانہ ہو کر الہٰ آباد پہنچے لیکن اِلہ آباد میں نہ جانے کیا ہوا کہ غالبؔ نے چوبیس گھنٹے سے زیادہ یہاں قیام نہیں کیا۔

مالک رام صاحب نے غالبؔ کے اس سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:-

"غالب کے ایک فارسی قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس سفر میں دو ہنگامے پیش آئے۔ پہلا الہ آباد میں دوسرا کلکتے میں۔ الہ آباد والے قضیے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا، ہاں کلکتے کے معرکے سے متعلق ان کی تحریروں میں کافی تفصیل موجود ہے۔"[۱۳]

مالک رام صاحب مرحوم نے جس فارسی قصیدے کا حوالہ دیا ہے۔ اُس کا ایک شعر ہے:-

نفس بلرزہ زِ بادِ نہیبِ کلکتہ
نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہٰ آباد

اس شعر سے بظاہر یہی مطلب نکلتا ہے کہ کلکتے کی طرح الہ آباد میں بھی کوئی ادبی معرکہ ہوا تھا۔
مالک رام صاحب کی کتاب "ذکرِ غالبؔ" پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:-

" نفس بلرزہ زبادِ نہیبِ کلکتہ
نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہٰ آباد

"غالبؔ کے اس شعر کی بنا پر (مالک رام نے) لکھا ہے کہ سفر کلکتہ میں غالبؔ کے خلاف ایک ہنگامہ الہ آباد میں بھی ہوا تھا۔ مجھے شبہہ ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح غلام امام شہید سے تھا۔ میں اس وقت تک یہ کہنے سے قاصر ہوں

کہ ''ہنگامۂ الہ آباد'' سے غالب کی کیا مراد ہے لیکن یہ شعر کلیاتِ فارسی طبع اول میں موجود ہے۔''[14]

یہ حقیقت ہے کہ غالب، غلام امام شہید سے خوش نہیں تھے۔ بقول قاضی عبدالودود شہید کی جو قدر حیدر آباد میں ہوئی۔ وہ غالب کو بہت ناگوار گزری۔ غالب نے اپنے ایک شاگرد محمد حبیب اللہ ذکا کو ۲۶ / اگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھا تھا:-

''اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگردِ قتیل وہاں کوسِ انا و لا غیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور دکھا رہے ہیں۔''[15]

غلام امام شہید الہ آباد کے تھے۔ ممکن ہے کہ الہ آباد میں غالب کا قیام شہید کے ہاں ہوا ہو اور ممکن ہے کہ پہلے ہی دن شہید سے غالب کی کسی معاملے میں تلخ کلامی ہوگئی ہو۔ غالب نے محمد علی خاں کو جو خط لکھا تھا، جس کا متعلقہ اقتباس آگے نقل کیا جائے گا۔ اُس میں یہ فقرہ خاص طور سے قابلِ غور ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ الہ آباد میں ''شائستۂ مردمِ بزم'' بھی نہیں ہیں۔ ان الفاظ کا بظاہر یہ مطلب نکلتا ہے کہ الہ آباد میں ایسے لوگ نہیں ہیں جو محفل میں شریک ہونے کے قابل ہوں۔ یہ بات تو اسی وقت کہی جا سکتی ہے، جب الہ آباد کی کسی محفل میں غالب کے ساتھ کسی کا رویہ غیر شائستہ اور غیر مہذب رہا ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب جس دن الہ آباد پہنچے تھے، ممکن ہے اسی دن کوئی ادبی محفل منعقد ہوئی ہو اور اس محفل میں غلام امام شہید شریک ہوئے ہوں۔ شہید قتیل کے شاگرد تھے۔ ممکن ہے غالب کی شہید یا کسی اور سے تلخ کلامی ہوگئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس تلخ کلامی میں شہید نے قتیل کی تعریف کی ہو یا اُن کے اشعار سند کے طور پر پیش کیے ہیں لیکن یہ سب میرا قیاس ہے۔ اس کے لیے شواہد موجود نہیں ہیں۔

غالب کو اس شہر میں اپنی مطلوبہ دوائیں نہیں ملیں۔ یہاں کے لوگ غالب کو غیر شائستہ اور غیر مہذب لگے۔ محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالب نے الہ آباد کے بارے میں

اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے ہیں :-

"ساتویں دن، میں اُس ویرانے (الہ آباد) میں پہنچا۔ آہ از الہ آباد۔ ایسے خرابے پر خدا کی لعنت۔ کہ جہاں بیمار کے لیے کوئی دوا نہ ملے، نہ کوئی اور چیز ملے۔ لوگ آدابِ محفل سے ناواقف ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں محبّت اور مرّوت نہیں۔ اس شہر کی آبادی روسیاہی کا سبب ہے۔ برباد شہر ہے۔ اس ہولناک وادی کو شہر کہنا بے انصافی ہے (یہاں فارسی متن الجھا ہوا ہے، جو بظاہر متن نقل کرنے والے کی کوتاہی کا نتیجہ ہے) غالبؔ کی مراد یہ ہے کہ اس شہر میں انسانوں کے ساتھ بھوت رہتے ہیں۔ چوں کہ اس شہر کو صحنِ جہنم کا مقابل ٹھہراتے ہیں۔ اس لیے وہ آگ سے بھر گیا ہے۔ الہ آباد نے خود کو بنارس کے قریب پہنچا دیا ہے اور گنگا کو الہٰ آباد کی شفاعت کے لیے اُس کی طرف روانہ کیا ہے

ہر چند اس روسیاہ (الہ آباد) کی طرف دیکھنا بنارس کی طبعِ نازک پر گراں ہے ۔لیکن چوں کہ دونوں کے درمیان گنگا ہے، اس لیے الہ آباد کے دل کو تقویت حاصل ہے۔

خدا کی قسم اگر (دہلی کو) میری واپسی الہ آباد سے گزرنے پر منحصر ہو تو میں ترکِ وطن کردوں گا اور واپس نہ جاؤں گا۔

قصہ مختصر ایک رات اور ایک دن اُس بھوت پریت کے شہر میں اس لیے گزارے کہ وہاں بار برداری کے ذرائع نہیں مل سکے تھے۔ اس جرم میں مجھے الہ آباد میں قید میں رہنا پڑا۔"[16] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ نے الہ آباد میں ایک دن اور ایک رات ہی قیام کیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بقول غالبؔ:

''دوسرے دن ایک بیل گاڑی کرائے پر مل گئی۔ صبح کے وقت گنگا کے ساحل پر پہنچ گیا۔ ہوا کی طرح تیزی سے پانی پر سے گزرا (گنگا پار کر لی) پائے شوق کے ساتھ بنارس کی طرف سرگرم سفر ہو گیا۔ جس دن بنارس پہنچا، بادۂ جانفزا، اور ٹھنڈی ہوا، مشرق کی طرف سے چل رہی تھی، جس سے میری جان کو طاقت ملی اور دل میں تازگی پیدا ہو گئی۔ اُس ہوا کے اعجاز نے اس غبار کو (یعنی میرے جسم کو) علمِ فتح کی طرح بلند کر دیا۔''[17] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ الہ آباد سے روانہ ہو کر بنارس پہنچ گئے تھے۔

غالبؔ نے دہلی کے اپنے ایک دوست رائے چھج مل کو ایک خط لکھا تھا، جس میں وہ قطعہ نقل کیا، جو غالبؔ نے بنارس پہنچنے پر کہا تھا۔ خط میں غالبؔ نے لکھا ہے:۔

''رائے صاحب مشفقِ شفیق تھکے ہاروں کے غم خوار اور تباہ حال لوگوں کے مددگار۔ سلامت رہیں۔ کیا لکھوں؟ میرے پاس لکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر (جسم کے) اندر کی بات کروں تو معدے اور آنتوں کی بیماری بدستور رہے اور وہی برودتِ جگر، حرارتِ قلب کی کمزوری ہے اور اگر باہر کی بات کروں تو وہ اس سے بھی زیادہ ہے:

قطعہ

غالبؔ حزیںؔ ، مغلوبِ سطوتِ غمِ دلِ
جاں نبود ، کاندر تنش ز ضعفِ تواں گفت
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است
مارا بدیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود[18]

جس دن غالبؔ بنارس پہنچے، مشرق سے بادۂ جاں فزا اور نسیم سحر چل رہی تھی، جس سے

جان میں توانائی آئی اور دل کو طمانیت نصیب ہوئی۔

غالبؔ نے محمد علی خاں کے نام ایک خط میں بنارس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:-

''بنارس کی ہوا کے اعجاز نے میرے غبارِ وجود کو علمِ فتح کی طرح بلند کر دیا اور وجد کرتی ہوئی نسیم کے جھونکوں نے میرے ضعف اور کمزوری کو بالکل دور کر دیا مرحبا! اگر بنارس کو اس کی دل کشی اور دل نشینی کی وجہ سے میں سویدائے عالم کہوں تو بجا ہے۔ مرحبا۔ اس شہر کے چاروں طرف سبزہ و گل کی ایسی کثرت ہے کہ اگر اسے زمین پر بہشت سمجھوں تو روا ہے۔ اس کی ہوا کو یہ خدمت سونپی گئی ہے کہ وہ مردہ جسموں میں روح پھونک دے۔ اس کی خاک کا ہر ذرہ راہرو کے پاؤں سے پیکانِ خار باہر کھینچ لے۔ اگر گنگا اس کے پاؤں پر اپنا سر نہ رگڑتا تو ہمارے دلوں میں اُس کی اتنی قدر نہ ہوتی۔ اگر سورج اس کے در و دیوار سے نہ گزرتا تو اتنا تابناک اور منور نہ ہوتا۔ بہتا ہوا دریائے گنگا اُس سمندر کی طرح ہے، جس میں طوفان آیا ہوا ہو۔ یہ دریا آسمان پر رہنے والوں کا گھر ہے۔ (اس سے غالبؔ کی غالباً مراد یہ ہے کہ اس دریا کی لہریں آسمان کو چھوتی ہیں)۔ سبزہ رنگ پری چہرہ حسینوں کی جلوہ گاہ کے مقابلے میں قدسیانِ ماہ تابی کے گھر کتاں کے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُس شہر کے عمارتوں کی کثرت کا ذکر کروں تو وہ سراسر مستوں سے آباد ہیں اور اگر اس شہر کے اطراف سبزہ و گل کا بیان کروں تو دور دور تک بہارستان نظر آئے۔''[19] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ جب بنارس پہنچے ہیں تو پانچ دن تک سرائے نیرنگ آباد میں، جسے عام طور پر نورنگ آباد کہتے ہیں، مقیم رہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے نورنگ آباد کے عقب میں میاں رمضان اور مٹھالی کی حویلی میں گوسی خانساماں کی حویلی

سے ملحق ایک مکان کرائے پر لے لیا۔''[20]

جن دنوں غالب بنارس میں تھے بظاہر اُن کا کوئی سر پرست، مداح، عقیدت مند یا شاگرد اُس شہر میں نہیں تھا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب نے بنارس میں اتنے دن کیوں قیام کیا اور بنارس کی اتنی تعریف کیوں کی۔ غالب بنارس میں گمنام زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ اُن کے مزاج کے قطعاً خلاف تھا۔

تقریباً چار ہفتے بنارس میں قیام کر کے غالب گھوڑے پر سوار ہو کر سڑک کے راستے پٹنہ اور وہاں سے مرشد آباد پہنچے۔

غالب کے لیے بنارس شہر کی حیثیت اس نخلستان کی تھی جو تپتے ہوئے ریگستان میں طویل سفر کے بعد مسافر کے لیے فردوسِ بریں کا درجہ رکھتا ہو جس کا ٹھنڈا پانی، ٹھنڈی ہوائیں اور درختوں کی حیات بخش چھاؤں جسم اور روح کے جلتے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام کرتی ہے۔

غالب جب چلّہ تارا سے الہ آباد کے لیے روانہ ہوئے ہیں تو اُن کے ساتھ گھوڑا بھی تھا۔ جیسا کہ نواب محمد علی خاں کے نام خط میں غالب نے لکھا ہے کہ ''ایک کشتی کرائے پر لی اور گھوڑا اور آدمی اور سامان، سب اس میں جیسے تیسے ڈالے۔''

غالب نے باندے سے مودھا تک کا سفر بیل گاڑی پر چلّہ تارا سے الہ آباد تک کشتی میں سفر کیا تھا۔ غالب نے باندہ اور زیادہ اِمکان ہے کہ مودھا میں گھوڑا خریدا تھا۔ یہ وہی گھوڑا ہے جسے کلکتے میں مالی حالت خستہ ہونے پر غالب نے ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کر دیا تھا۔

اس لڑھیا پر غالب مودھا سے چلّہ تارا کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ لڑھیا اتنی آہستہ چلتی تھی کہ وہ مودھا اور چلّہ تارا کے درمیان چوبیس میل کا راستہ ایک دن میں طے نہیں کر سکی۔ غالب کو مجبوراً راستے میں ایک گاؤں میں قیام کرنا پڑا۔ دوسرے دن علی الصبح

غالبؔ گھوڑے پر سوار ہو کر اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔''

طویل بیماری کے بعد جب غالبؔ بنارس پہنچے تو انھیں اچانک بیماری سے نجات مل گئی۔ وہ ایک مہینے بنارس میں رہے۔ اس شہر کی حیثیت غالبؔ کے لیے اس نخلستان کی بن گئی جو تپتے ہوئے ریگستان میں طویل سفر کے بعد مسافر کے لیے فردوسِ بریں کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا ٹھنڈا پانی، ٹھنڈی ہوائیں اور درختوں کی حیات بخش چھاؤں جسم اور روح کے جلتے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام کرتی ہے۔[۲۱]

غالبؔ بنارس سے کلکتے تک کا سفر کشتی کے ذریعے طے کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ جمنا کے کنارے کشتی والوں کے پاس گئے تو کشتی بانوں نے اُن کے ساتھ بدمعاملگی کی۔ غالبؔ نے جس کشتی والے سے بات کی اس نے کلکتے تک کا کرایہ سو روپے اور پٹنے تک کا بیس روپے طلب کیا۔ غالبؔ کے لیے اتنی بڑی رقم دینا مشکل تھا، اس لیے اُنھوں نے طے کیا کہ وہ باقی سفر گھوڑے ہی پر طے کریں گے۔

غالبؔ کلکتے میں

غالبؔ نے دہلی سے کلکتے اور کلکتے سے دہلی کا تقریباً تین ہزار کلومیٹر کا سفر گھوڑے، یکّے، لڑھیا (بیل گاڑی) اور کشتی کے ذریعے طے کیا تھا۔ وہ فیروز پور، کان پور، لکھنؤ، باندہ، الہ آباد، بنارس، عظیم آباد اور مرشد آباد ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے۔ اس طویل سفر میں کون سی ایسی مصیبت تھی جس کا اُن کو سامنا نہیں کرنا پڑا ہو۔ سفر کے دوران غالبؔ کسی خطرناک بیماری کا شکار ہو گئے۔ ممکن ہے یہ مرض پہلے ہی سے ہو اور سفر کے دوران بڑھ گیا ہو۔ لکھنؤ میں پانچ مہینے علاج کرایا مگر افاقہ نہیں ہوا۔ لکھنؤ سے کان پور ہوتے ہوئے باندہ پہنچے، یہاں اُن کا تقریباً چھ مہینے قیام رہا۔ کئی مہینے علاج کے بعد صحت یاب ہو کر کلکتے کے سفر پر نکلے۔ اس پورے سفر میں جدید سہولتیں حاصل ہونے کے باوجود ہم اس راستے سے کلکتے تک کے سفر کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے، جو غالبؔ نے اپنی ہمت اور بلند حوصلگی کے سہارے

۱۷۷ سال پہلے طے کیا تھا۔ بیماری، کمزوری، نقاہت اور مالی دشواری بھی انھیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکی۔

دہلی سے کلکتہ کے طویل اور دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہوئے غالبؔ ۲۰رفروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے۔ غالبؔ کے سفر کی جو تفصیلات پچھلے باب میں بیان کی گئی ہیں، اس کے پیشِ نظر غالبؔ کا درجِ ذیل بیان ہرگز مبالغہ آمیز معلوم نہیں ہوتا۔ غالبؔ نے کلکتے پہنچ کر نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں اس سفر کے بارے میں لکھا تھا:

''میں گردِ راہ کی طرح گرتا پڑتا کوہ و بیابان میں ہر قدم پر پتھروں اور کانٹوں کی دھار پر چلتا ہوا، کبھی راتوں کی سردی سے افسردہ و پریشان اور کبھی گردشِ ایام کی ستم گری سے نالاں، چوتھی شعبان کو دن کا کچھ وقت گزرنے پر کلکتے پہنچا۔''[1] (فارسی سے ترجمہ)

یہی خط 'پنج آہنگ' میں بھی نقل ہوا ہے مگر اس میں عبارت بہت ترمیم شدہ ہے۔ اپنے اس سفر کے بارے میں غالبؔ نے لکھا ہے:

''میں خارزاروں سے گزرتے ہوئے تلوار کی دھار پر چل کر ستم رسیدہ اور نالاں سہ شنبہ چہارم شعبان کی صبح کلکتے پہنچا۔''[2] (فارسی سے ترجمہ)

نواب محمد علی خاں کے نام جس خط کا اقتباس پہلے نقل کیا گیا ہے، اس میں غالبؔ نے اطلاع دی ہے کہ:

''انھیں کرایے پر ایسا مکان مل گیا ہے، جس میں ہر قسم کی راحت و آسائش موجود ہے۔ بہت کھلا مکان ہے۔ بیت الخلا بھی بہت بڑا ہے، صحن میں میٹھے پانی کا کنواں بھی ہے۔ اس مکان کی چھت پر اہلِ ثروت کے لائق ایک آرام گاہ بھی ہے اس مکان کے بارے میں غالبؔ نے مزید لکھا ہے کہ بغیر کسی تلاش کے اور بغیر کوئی زحمت اُٹھائے یہ مکان چھے روپے ماہوار کرایے پر مل گیا۔''[3] [4]

غالبؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''یہ مکان انسانوں اور جانوروں دونوں کے لیے باعثِ راحت ہے۔ جانوروں سے غالباً مراد وہ گھوڑا ہے، جس پر غالبؔ نے باندے سے کلکتے تک کا سفر کیا تھا۔ اس مکان کا پتا تھا۔ ''شہر کلکتہ قریب چیت بازار، در شملہ بازار، نزدیکِ تالاب۔''[۵] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ کی پنشن کا قضیہ

یہ سیاسی روئداد ۲ رمئی ۱۸۲۸ء کو لکھی گئی اور ۱۵ راپریل ۱۸۲۸ء کو پیش کی جانے والی عرض داشت گورنر جنرل کے نام ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کلکتے میں جب غالبؔ سائمن فریزر سے ملنے گئے تو فریزر نے پوچھا کہ ''نواب گورنر جنرل کے لیے کوئی درخواست لائے ہو؟ تو غالب نے گورنر جنرل کے نام ایک عرض داشت مورخہ ۲ رمئی ۱۸۲۸ء اُن کو پیش کردی۔

اس عرض داشت کے اہم نکات ہیں:

نصراللہ بیگ خاں ہاتھی سے گر پڑے اور ایسی چوٹ لگی کہ جاں بر نہ ہو سکے۔ لاولد تھے، اُن کے حسبِ ذیل ورثا تھے:

(i) غالبؔ (نصراللہ بیگ خاں کے بھتیجے)

(ii) دوسرے بھتیجے مرزا یوسف (غالبؔ کے چھوٹے بھائی)

(iii) نصراللہ بیگ خاں کی والدہ

(iv) نصراللہ بیگ خاں کی تین بہنیں

(v) خواجہ حاجی نامی ایک شخص نصراللہ بیگ خاں کے گھرانے کا ملازم تھا۔ اس نے نصراللہ بیگ کے سارے مال و متاع، فرنیچر، خیمہ، اونٹوں، پالکیوں وغیرہ پر قبضہ کرلیا اور ستّر اسّی سواروں، ایک ہاتھی اور تمام سامانِ حرب کے ساتھ نصراللہ بیگ خاں کے سسر نواب احمد بخش خاں سے جاملا۔

(vi) اس زمانے میں حکومت نے ہمیشہ کے لیے فیروز پور، جھرکہ، پونا ہانا، نگینہ سانکرس (Sankurus) اور دوسرے اضلاع (تین لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر) نواب احمد بخش خاں کو اس شرط پر دے دیے کہ وہ پچیس ہزار روپے سالانہ برطانوی حکومت کے خزانے میں داخل کرتے رہیں گے۔

(vii) نواب احمد بخش خاں نے جنرل لیک سے درخواست کی کہ سونک اور سونسا کے جاگیردار نصراللہ بیگ خاں کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ اپنے پیچھے پچاس سوار اور بہت سے عزیز واقارب چھوڑ گئے ہیں۔ اس کی منظوری دی جائے کہ یہ پچاس سوار ہمیشہ میری سپردگی میں رہیں اور حکومت کو ضرورت پڑنے پر وہ یہ سوار پیش کردیں نیز عزیز واقارب کے اخراجات کی رقم ادا کرنے کی بھی منظوری دی جائے۔ فیروز پور جھرکہ، پونا ہانا وغیرہ کے معاوضے کے طور پر پچیس ہزار روپے کی جو رقم سالانہ ادا کرنی ہوتی ہے، وہ معاف کردی جائے۔ اس میں سے پندرہ ہزار روپے سالانہ پچاس سواروں پر خرچ ہوں گے اور دس ہزار روپے سالانہ نصراللہ بیگ کے وارثوں میں تقسیم کیا جاتا رہے گا۔ حکومت نے یہ درخواست منظور کرلی۔

(viii) نواب احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی کو کچھ عرصے ملازم رکھ کر برطرف کردیا۔ اُنھوں نے اعلان کیا کہ حکومت نے پانچ ہزار کی جو رقم نصراللہ بیگ کے عزیز واقارب کی کفالت کے لیے بطور پنشن مقرر کی ہے۔ اس کی تقسیم اس طرح ہوگی:

۱- خواجہ حاجی =/۲۰۰۰ روپے سالانہ

۲- نصراللہ بیگ خاں کی والدہ =/۱۵۰۰ روپے سالانہ

۳- غالب اور اُن کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف =/۱۵۰۰ روپے

(ix) غالبؔ کا کہنا تھا کہ حکومت نے پانچ ہزار نہیں دس ہزار روپے سالانہ طے کیے تھے۔

(x) بقول غالبؔ نواب احمد بخش خاں نے اپنے ایک ملازم کو نصر اللہ بیگ خاں کے وارثوں میں شریک کر دیا ہے، جو صریحاً غلط تھا۔

(xi) غالبؔ کا یہ بھی کہنا تھا کہ حکومت نے پچاس سواروں کے خرچ کے طور پر پندرہ ہزار روپے سالانہ رقم مقرر کی تھی۔ چوں کہ سواروں کا یہ دستہ تحلیل کر دیا گیا ہے۔ اس لیے نواب احمد بخش خاں کو یہ رقم حکومت کو واپس کرنی چاہیے۔

(xii) غالبؔ کے تین مطالبے تھے۔ حکومت کو چاہیے کہ نصر اللہ خاں کے وارثوں کا خود تعین کرے۔

(xiii) ہر ایک وارث کو الگ الگ پنشن دی جائے، غالبؔ کو ان سب حصہ داروں کا نگراں بنایا جائے۔

(xiv) نواب احمد بخش خاں نے جو رقم نصر اللہ بیگ خاں کے جائز وارثوں کو نہیں دی اور جو رقم پچاس سواروں کے دستے پر خرچ نہیں کی وہ سب نواب صاحب کی جاگیر سے وصول کی جائے۔

(xv) چوں کہ نواب احمد بخش کا نصر اللہ بیگ خاں سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس لیے یہ پنشن سرکاری خزانے سے ادا کی جائے۔

اب خواجہ حاجی کے لڑکوں کے سگے ماموں مرزا افضل بیگ خاں کی طرف سے پیش ہونے والا جواب دعوے ملاحظہ ہو:

افضل بیگ خاں کی طرف سے دائر کردہ جواب دعویٰ مورخہ ۸/ مارچ ۱۸۳۰ء کی نقل

(فارسی سے اردو)

غریب پرور سلامت!

افضل بیگ خاں جو خواجہ شمس الدین عرف خواجہ جان اور خواجہ بدر الدین عرف خواجہ امان پسرانِ خواجہ حاجی مرحوم نمک پروردہ سرکاری عالیہ کا مختار ہے، کی جانب سے اسد اللہ خاں کی عرضی کا جواب حسبِ ذیل ہے:

۱۸۰۶ء میں فیروز پور جھرکہ، سانگرس، پونا، ہانا، وبچھورو، نگینہ کی جاگیریں نواب احمد بخش خاں کو استمراری حق (لگان داری) پر مع سند دس مخصوص شرائط کے مطابق نسلاً بعد نسل عطا ہوئیں۔

اوّل: یہ کہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرحوم کے زیرِ کفالت افراد خواجہ وغیرہ کی پرورش اور دیکھ بھال نواب موصوف کے ذمہ ہوگی۔

دوم: یہ کہ پچاس سوار بوقتِ ضرورت سرکار کے لیے حاضر کیے جائیں۔ اگرچہ نواب موصوف نصر اللہ بیگ مرحوم کے زیرِ کفالت افراد یعنی خواجہ حاجی وغیرہ کو صرف پانچ ہزار روپے سالانہ دیتے تھے یعنی مبلغ دو ہزار روپے خواجہ حاجی کو مبلغ ایک ہزار پانچ سو روپے مرحوم کی بہنوں کو ایک ہزار پانچ سو روپے اسد اللہ خاں اور مرزا یوسف کو جو نصر اللہ بیگ خاں مرحوم کے بھتیجے تھے سالانہ ملتے تھے۔ گزشتہ سال اسد اللہ خاں نے اولاً شرکا کی رضامندی سے نواب احمد بخش مرحوم کے ورثا کے خلاف تنخواہ میں اضافے کے لیے ایک عرضی حضور کی خدمت میں پیش کی۔ ثانیاً طمع اور بے انصافی کے تحت خواجہ حاجی خاں کے بیٹوں کو ان کے حق سے محروم کرنے کے لیے ایک دوسری عرضی پیش کی اور خواجہ حاجی کے بیٹوں کی، جو اسد اللہ بیگ کے لیے بھی واجب الاحترام بزرگ ہیں، تحقیر و تذلیل کو مفید مطلب سمجھتے ہوئے لکھا کہ خواجہ حاجی ہرگز اس امر کے مستحق نہیں کہ سرکار ان کی کفالت کا اہتمام کرے۔

غریب پرور! دشمنی اور کینہ پروری نے اسد اللہ خاں کے ذہن کو بالکل ماؤف کر دیا ہے یہاں تک کہ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ حکومت کے اہل کاروں کو امورِ مملکت کے انتظام میں تعلیم

دینے پر کمر بستہ ہے اور حکومت کے خیر خواہوں کی درجہ بندی اور کفالت کے سلسلے میں کسی کوتاہی کو سرکاری اہل کاروں کی غفلت پر محمول کرتا ہے۔ اگر سرکاری اہل کاروں کو خواجہ حاجی کی خیر خواہی اور خدمت گزاری پر مکمل اعتماد نہ ہوتا اور خواجہ حاجی خاں کی نصراللہ بیگ مرحوم کی معیت میں حسنِ خدمت کے صلے کے طور پر خواجہ حاجی اور اس کی اولاد کی کفالت سرکاری اہل کاروں کی خصوصی توجہ کا مرکز نہ ہوتی تو خواجہ حاجی کا نام نصراللہ بیگ مرحوم کے زیرِ کفالت افراد کے زمرے میں شامل نہ ہوتا اور حضور کی جانب سے عطا کردہ سند میں اس کا نام کمپنی انگریز بہادر کی حکومت کی سرپرستی کے مستحق افراد میں درج نہ ہوتا۔ دیگر دلائل سے قطع نظر سند کی عبارت بلاشبہ خواجہ حاجی مرحوم کے لازوال استحقاق کے لیے ایک ناقابلِ تردید دلیل ہے۔

ثانیاً: اسداللہ خاں خواجہ حاجی کے بیٹوں کی رسوائی کی غرض سے لکھتا ہے کہ خواجی حاجی یعنی فدوی کے بھانجوں کا باپ نصراللہ بیگ خاں کا غلام زادہ اور نمک خوار تھا۔ خواجہ مرزا، خواجہ حاجی کا باپ نصراللہ بیگ خاں کے باپ کے پاس صرف پانچ روپے ماہانہ پر بطور سائیس ملازم تھا لیکن خاں مذکور کو اپنے بیان کے تناقص کی پرواہ کیے بغیر دوبارہ لکھتا ہے کہ نصراللہ بیگ خاں کی ماں نے اپنی بھانجی کا نکاح جو اس بزرگ خاتون کو اپنی بیٹی کی طرح عزیز تھی خواجہ مرزا کے ساتھ کر دیا اور خواجہ حاجی مرحوم بن خواجہ مرزا اسی بیٹی کے بطن سے ہے۔ غریب پرور! نصراللہ بیگ خاں کی ماں اور اسداللہ خاں کی دادی کی حالت پر تاسف ہے کہ بقول اسداللہ خاں اس نے اپنی بھانجی کا نکاح کمال رضامندی کے ساتھ ایک غیر اور گھٹیا شخص کے ساتھ کر دیا۔ حیف ہے اسداللہ خاں کے حال پر کہ وہ خواجہ حاجی کے لیے جو اس کی دادی کی بھانجی کا بیٹا ہے۔ غلام زادہ اور اسی قسم کے دوسرے ہتک آمیز الفاظ استعمال کرتا ہے ۔حالاں کہ یہ شخص (اسداللہ خاں) خود گھٹیا ہے۔ نصراللہ بیگ خاں کی ماں یعنی اس (اسداللہ خاں) کی دادی نے اپنی بہن کی عزت افزائی و خاطر داری کے لیے خواجہ حاجی

کو دودھ پلایا اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ جب خواجہ حاجی جوان ہو جائے تو کوئی اس سے پردہ نہ کرائے لیکن اسد اللہ خاں اپنے بزرگوں کے برعکس اپنی دادی کی بہن اور اس کی اولاد کی قدر افزائی کی بجائے ان کی عزت کو حاکمانِ وقت کے حضور بار بار اپنی زبان درازی سے مجروح کرتا ہے اور اپنے بزرگوں کی توہین و تحقیر کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا ہے۔ غریب پرور! اسد اللہ خاں اولاً خواجہ حاجی خاں سے کسی قسم کی رشتہ داری سے انکار کرتا ہے اور خواجہ حاجی کو صرف نصر اللہ بیگ خاں کے نوکروں کے زمرے میں شمار کرتا ہے اور آخر کار نصر اللہ بیگ مرحوم اور خواجہ حاجی مغفور کے درمیان کمزور تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

خانِ مذکور پر یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ خواجہ حاجی مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرحوم کے زیرِ کفالت افراد میں سب سے اوّل نمبر پر ہے۔ سند کی عبارت نصر اللہ بیگ خاں مرحوم کے زیرِ کفالت افراد یعنی خواجہ حاجی کی کفالت و نگہداشت وغیرہ ان کے ذمہ ہے اس امر پر صریحاً دلالت کرتی ہے۔ لغوی طور پر توسل کے معنی ہیں کسی چیز کے واسطے سے نزدیکی چاہنا اور توسل الیہ سے مراد ہے (بوسیلہ الی القرب الیہ بعمل)۔ اس صورت میں خواجہ حاجی پر لفظ متوسل کا اطلاق دوسروں کی نسبت نہایت صحیح اور واضح ہے۔ عرف عام میں متوسلین کا لفظ ان رشتہ داروں، دوستوں اور غیروں پر صادق آتا ہے جن کا تعلق کسی دوسرے شخص سے ہو۔ چناں چہ گورنر جنرل بہادر کا متوسل اور نامور بادشاہوں کے متوسلین وغیرہ کا لفظ خواص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خواجہ حاجی جو نصر اللہ بیگ خاں کی خالہ کا نواسا ہے اور مہمات کے انتظام میں بھی ان کے ساتھ رہا ہے، قرابت داری اور دوستی کے اعتبار سے نصر اللہ بیگ خاں مرحوم کے خصوصی متوسلین میں سے ہے اور دوسرے اشخاص نصر اللہ بیگ خاں کے عمومی متوسلین میں داخل ہیں۔ چناں چہ سند میں متوسلین سے متعلق جو عبارت درج ہے وہ ان ہی حقائق کے مصداق ہے اور نصر اللہ بیگ خانِ مرحوم کی رفاقت میں خواجہ حاجی کے خدمات، جانفشانی اور اعتبارات کے پیشِ نظر سرکاری اہل کار، خواجہ حاجی مرحوم کی اس پرداخت کو

اوّلین اور اہم تصور کرتے ہوئے خواجہ حاجی مذکور اور اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کی کفالت کرتے چلے آرہے ہیں۔ غریب پرور سلامت! اسداللہ خاں، خواجہ حاجی اور اس کے بیٹوں کو حق سے محروم کرنے کی خاطر معلّی القاب جارج بارلو گورنر جنرل بہادر کی عطا کردہ سند کو، جس پر خواجہ حاجی اور اس کے بیٹوں کے دعویٰ اور اسداللہ خاں اور اس کے بھائی اور نصراللہ بیگ خاں مرحوم کی بہنوں کی مخالفت کا دارومدار ہے، ساقط الاعتبار قرار دیتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ حضور کی سند میں خواجہ حاجی کے نام کا اندراج نواب احمد بخش خاں مرحوم کی غلط بیانی کی وجہ سے ہے کیوں کہ نواب احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی کو اپنے معاملات کا راز دار بنا رکھا تھا۔ انصاف پرور! اس صورت میں کہ نواب احمد بخش خاں مرحوم کو سندِ استمراری کا اجرا اور خواجہ حاجی وغیرہ نصراللہ بیگ خاں متوسلین کو سرکار کی طرف سے تنخواہ کا حصول سپہ سالار نامدار جنرل لارڈ لیک بہادر کے تجربہ و تحقیق کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا دارومدار احمد بخش کی بدنیتی اور غلط بیانی پر تھا سندِ استمراری اور دائمی تنخواہ کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا، اس لیے کہ جس شے کی بنیاد ہی دھوکہ اور فریب پر ہو وہ قابلِ اعتبار و استمرار نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ خواجہ حاجی اور اس کے بیٹوں کے حق کو غلط ثابت کرنے کی خاطر اسداللہ خاں نے خود اپنے حق کا ابطال بھی کر دیا ہے۔ اس سے اسداللہ خاں کے طمع و حرص اور واضح عناد کے سوا کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا۔

(مورخہ: ۸/مارچ ۱۸۳۰ء، افضل بیگ، مقام کلکتہ عبدہ افضل بیگ)

افضل بیگ خاں کی طرف سے پیش ہونے والے جواب دعوے کے چند اہم نکات ہیں:

۱- گزشتہ سال غالبؔ نے اولاً شرکا کی رضامندی سے نواب احمد بخش مرحوم کے ورثا کے خلاف تنخواہ میں اضافے کے لیے ایک عرضی حضور میں پیش کی۔

۲- بعد میں خواجہ حاجی کے بیٹوں کو اُن کے حق سے محروم کرنے کے لیے ایک دوسری عرضی پیش کی کہ خواجہ حاجی نصراللہ بیگ خاں کے ورثا میں نہیں ہیں۔ اس لیے اُن کے بیٹوں کو دی

جانے والی پنشن بند کی جائے۔

۳- دشمنی اور کنبہ پروری نے اسد اللہ خاں کے ذہن کو ماؤف کر دیا ہے۔ اب وہ سرکاری اہل کاروں پر الزام تراشیاں کرتے ہیں نیز سرکاری افسروں کو امورِ مملکت کے انتظام میں تعلیم دیتے ہیں۔

۴- اسد اللہ خاں ایک طرف دعویٰ کرتے ہیں کہ خواجہ حاجی کے والد اُن کے دادا کے پاس پانچ روپے ماہوار پر بطور سائیس ملازم تھے اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ نصر اللہ بیگ کی والدہ (یعنی اسد اللہ خاں کی دادی) کی ایک بھانجی تھیں جو انھیں بیٹی کی طرح عزیز تھیں۔ دادی نے اس لڑکی کی شادی خواجہ مرزا سے کر دی۔ خواجہ حاجی خواجہ مرزا اور اسی لڑکی کے صاحب زادے ہیں اگر اسد اللہ خاں کے دونوں بیان درست ہیں تو حیرت ہے کہ ایسے اعلا خاندان کی لڑکی کی شادی ایک سائیس کے ساتھ کیسے کر دی گئی؟

۵- مرزا افضل بیگ کا کہنا ہے کہ اسد اللہ خاں کی دادی نے خواجہ حاجی کو اپنا دودھ بھی پلایا تھا۔

۶- پنشن سے متعلق سند میں کہا گیا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں مرحوم کی زیرِ کفالت یعنی خواجہ وغیرہ کی کفالت ونگہداشت، اس سند میں صرف ایک نام لیا گیا ہے اور وہ ہے خواجہ حاجی کا، جس سے خاندان میں اُن کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۷- اسد اللہ خاں خواجہ حاجی کے بیٹوں کو اُن کے حق سے محروم کرنے کے لیے جارج بارلو گورنر جنرل بہادر کی عطا کردہ سند کو جعلی بتاتے ہیں۔ اگر یہ سند جعلی ہے تو خواجہ حاجی اور اُن کے لڑکے اسد اللہ خاں اور اُن کے خاندان کے دوسرے ورثا میں کوئی بھی پنشن کا حق دار نہیں ہے۔

۸- اسد اللہ خاں کا بھائی پاگل ہے اور شریعت کا مکلّف نہیں ہے۔ نیز اسد اللہ خاں کا مزاج اکثر و بیشتر قمر کے زوال و کمال کے ساتھ ساتھ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے۔ عین ممکن ہے

کہ یہ عرضی جو خاندان اور عزیزوں کی رُسوائی اور ذلت کا مرقع ہے، آثارِ قمر کے غلبے کے موقع پر تحریر کی گئی ہو۔ [1]

۹- جوابِ دعوے کے آخر میں درخواست کی گئی ہے کہ 'نواب احمد بخش کے اس معاہدے کے مطابق جو سرکاری اہل کاروں کے ساتھ طے پایا ہے۔ مبلغ چار ہزار روپے سالانہ تنخواہ اور باقی ماندہ رقم بھی خواجہ حاجی کے بیٹوں کو عطا فرمائی جائے۔'

غالبؔ کے دعوے کے جواب میں نائب معتمد اینڈر یو اسٹرلنگ نے مورخہ ۵؍مئی ۱۸۳۰ء کو ایف ہاکنز کے نام ایک خط میں گورنر جنرل کی اطلاع کے لیے لکھا کہ میری رائے میں اسداللہ خاں کو اس سے زیادہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں جتنا لارڈ لیک صاحب بہادر نے اُن کے اور اُن کے بھائی مرزا یوسف کے لیے مقرر کر دیا تھا یعنی پندرہ سو روپے سالانہ جو نواب شمس الدین خاں ہمیشہ ادا کرنے کے لیے تیار رہے ہیں۔'

دہلی کے قائم مقام ریذیڈنٹ نے غالبؔ کی عرض داشت کی نقل نواب شمس الدین خاں کو بھیج کر تفصیلی وضاحت طلب کی۔ نواب صاحب نے وضاحت میں جو خط لکھا، اس کے اہم نکات ہیں:

۱- اسداللہ خاں نے اپنی عرض داشت میں جن ناانصافیوں کا ذکر کیا ہے اور جن کے ازالے کے لیے وہ رجوع کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ نصراللہ خاں صاحب کے عزیز و اقارب کی کفالت کے لیے جو رقم مقرر کی گئی تھی۔ اُس کی مقدار سے وہ ناواقف ہیں۔

۲- اسداللہ خاں اپنے حصّے کی رقم ہمیشہ وصول کرتے رہے ہیں اور اس کی رسیدیں دفتر میں جمع کراتے رہے ہیں لیکن اب وہ مقررہ رقم سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔

۳- اسداللہ خاں شاعر ہیں اور شاعر ہونے کی حیثیت سے انھیں آزادی حاصل ہے کہ اپنی عرض داشت میں جس قدر چاہیں، مبالغہ آرائی سے کام لیں۔

۴-نواب شمس الدین نے لارڈ لیک کے احکامات کے حوالے سے پنشن کی رقم کی درج ذیل تفصیل بیان کی۔

i-اسد اللہ خاں نے پچاس سواروں کے سلسلے میں جو اعتراض کیا ہے۔ یہ معاملہ میرے اور سرکار کے درمیان ہے۔ اسد اللہ خاں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ii-اسد اللہ خاں صاحب نے وظائف میں اضافے کا مطالبہ کیا ہے، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے نصر اللہ خاں مرحوم کے ورثا کے لیے جو رقم ملتی ہے، میں اُن کو دے دیتا ہوں۔

کلکتے میں ایک سرکاری افسر تھے سائمن فریزر جو بہت اہم عہدے پر فائز تھے۔ غالبؔ نے اُن کے بارے میں لکھا ہے کہ 'عہدے کے لحاظ سے سائمن فریزر دادخواہوں اور منصفوں کے درمیان بلکہ سارے اہلِ حاجات و صاحبانِ کونسل کے درمیان ایک واسطہ ہیں'۔ مطلب یہ کہ تمام انصاف چاہنے والوں کی درخواستیں پہلے سائمن فریزر کے پاس پہنچتی تھیں اور پھر اُن کے حکم پر مزید کارروائی ہوتی تھی'۔

ایک دن غالبؔ سائمن فریزر کے پاس پہنچ گئے۔ سائمن نے بقول غالبؔ 'کھڑے ہو کر اُن کی تعظیم کی اور بغل گیر ہوئے۔ غالبؔ نے اپنا پورا مقدمہ اُنھیں سمجھایا۔ اُنھوں نے پوچھا کہ مقدمے کے سلسلے میں کوئی عرض داشت لائے ہو۔ غالبؔ نے گریبانِ قبا سے گورنر جنرل کے نام عرض داشت نکال کر سائمن فریزر کو پیش کر دی۔ فریزر سے غالبؔ کی پہلی ملاقات غالباً اسی دن ہوئی تھی۔ غالبؔ نے فریزر کے نام ایک عرض داشت لکھی تھی۔ اس کا پورا امکان ہے کہ اسی ملاقات میں فریزر کو یہ عرض داشت پیش کی ہو۔ عرض داشت درجِ ذیل ہے:

مسٹر فریزر کے نام اسد اللہ خاں غالبؔ کے مراسلہ مورخہ ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء کی نقل (فارسی سے اردو)

صاحب والامناقب، والاشان، عادل باانصاف، فیض پہنچانے والے،

آپ کا شان وشکوہ قائم رہے۔

خدمت عالی میں عرض گزار ہوں کہ فدوی سرکار عالی مقام کمپنی انگریزی بہادر دام اقبالہ، کے متوسلین، پرورش یافتگان اور نمک خواروں میں سے فدوی کے سگے چچا نصراللہ بیگ خاں، اعلیٰ خوبیوں کے مالک جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر کے عہد میں سرکار کی طرف سے چار سو سواروں کے رسالے کا افسر اور سرکار کی جانب سے ایک لاکھ روپے کی جاگیر کا مالک تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے لواحقین کی پرورش کے لیے احمد بخش خاں جاگیردار میوات کی جاگیر سے سرکار نے وظیفہ مقرر کیا۔ چوں کہ میں اس رقم کے تعیّن اور احمد بخش خاں کے طریقۂ تقسیم سے راضی نہیں ہوں، اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے خود کلکتہ آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ نواب والا القاب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کروں۔ صاحب ریذیڈنٹ شاہ جہان آباد کی خدمت میں فدوی کے حاضر نہ ہو سکنے کے دو وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ فدوی احمد بخش خاں کی زیادتیاں برداشت کرتا رہا پھر بھرت پور کی فتح تک احمد بخش خاں کے وعدے پر سفر سے دور رہا اور کان پور چلا گیا۔ کان پور میں بیمار پڑ گیا۔ یہ مفصّل روئداد میں نے آپ کی خدمت میں پیش کردہ عرضداشت میں بیان کر دی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جن دستاویزات پر میرے دعوے کا انحصار ہے ریذیڈنسی کے دفتر واقع شاہ جہان آباد میں نہیں ہیں۔

ایک رپورٹ جو احمد بخش خاں کی جاگیر اور سرکار انگریزی کی طرف سے اس پرزرِ استمراری کی معافی کے بارے میں والامناقب جنرل لارڈ لیک صاحب بہادر نے (۱۸۰۶ء) کو کلکتہ سے ارسال کی تھی وہ بھی کلکتہ کے دفتر میں موجود ہوگی۔ چوں کہ دہلی، کلکتہ اور ہندوستان کے جملہ شہر ایک ہی حکومت کے تابع ہیں لہذا فدوی حصولِ انصاف اور کامیابی کی امید سے بے سروسامانی، بیماری اور ناتوانی کی حالت میں دو سو فرسنگ (چھ سو میل) کا فاصلہ طے کر کے

اس دادگاہ تک پہنچا ہے اور اس مقدمے سے فدوی کا مقصد سرکار جہاں مدار کی خیر اندیشی اور حصول حمایت ہے۔ چناں چہ میری عرض داشت کے ملاحظے کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی۔ امید ہے کہ فدوی کی درخواست حضور سراپا نور کی پُر برکت نظر سے فیض یاب ہوگی۔ آپ کے اقبال اور حکومت کا سورج تاباں اور درخشاں رہے۔

عرضی

اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ برادرزادۂ نصراللہ بیگ خاں

جاگیردار سونک سونسا

لفافے پر:

صاحب والاتوصیفات،

عادل اور فیض بخش جناب فریزر صاحب بہادر

دام شوکتہٗ کی پرستانہ نظر فیض اثر سے گزرے

اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ برادرزادہ مرزا نصراللہ بیگ خاں جاگیردار سونک سونسا کی عرض داشت

مرقومہ۔ ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء

عرضی

اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ

برادرزادۂ نصراللہ بیگ خاں۔۔ جاگیردارِ سونک سونسا

لفافے پر فریزر کا نام اور عہدہ اس طرح لکھا گیا تھا۔ والا مرتبت، والا شان، داورِ دادرس، فیض رساں

فریزر صاحب بہادر دام شوکتہ کی نظرِ فیض مظہر سے گزرے۔

عرض داشت اسد اللہ عرف مرزا نوشہ برادر زادۂ مرزا نصر اللہ بیگ خاں جاگیر دارِ سونک سونسا

معروضہ ۲۸ ؍ اپریل ۱۸۲۸ء

سرکاری افسروں نے غالبؔ کو بتایا تھا کہ غالبؔ نے براہِ راست کلکتے آ کر غلطی کی ہے۔ کیوں کہ انھیں اپنی عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کول بروک کو پیش کرنی چاہیے تھی لیکن جب سائمن نے غالبؔ کی عرض داشت لے کر رکھ لی تو غالبؔ کو یہ خیال ہوا کہ غالبؔ نے ریذیڈنٹ کے ذریعے درخواست نہ بھیجنے کی جو غلطی کی تھی، اُسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سائمن فریزر نے وہ درخواست اپنے پاس رکھ لی۔ جب غالبؔ رخصت ہونے لگے تو سائمن فریزر نے عطر و پان سے اُن کی تواضع کی اور کھڑے ہو کر غالبؔ کا سلام قبول کیا۔ سائمن کے اس رویّے سے غالبؔ خوش خوش اپنے گھر واپس آئے۔ کچھ دن بعد غالب سائمن فریزر سے پھر ملے۔ سائمن کا رویّہ بہت ہمدردانہ تھا۔ اُنھوں نے غالبؔ کو بتایا کہ برطانوی افسر باٹن صاحب فارسی درخواستوں کا ترجمہ کرتے ہیں اور فریزر کا کام ہے کہ وہ فارسی سے انگریزی ترجموں کا موازنہ کریں۔ فریزر نے فارسی کی ایک تحریر دکھاتے ہوئے غالبؔ سے کہا کہ یہ آپ کی عرض داشت ہے۔ اس کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور میں نے اس کا فارسی سے مقابلہ بھی کر لیا ہے۔ اب یہ صاحبانِ کونسل کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ فریزر نے یہ بھی کہا کہ آپ کا حق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا ہے اور اراکین سرکار کسی کے حق کی ادائیگی میں کوئی لحاظ نہیں کرتے۔

اس وقت کلکتے میں ایک اور افسر تھے اینڈریوز اسٹرلنگ ۔۔۔ یہ کونسل میں بہت اعلا عہدے پر فائز تھے۔ اُن کے بارے میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ 'ایک افسر اینڈریوز اسٹرلنگ، کونسل میں اعلا عہدے پر فائز ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ صاحبِ علم اور سخن فہم ہیں۔ شعر کی لطافت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں نے اُن کی مدح میں پچپن اشعار کا ایک قصیدہ کہا ہے۔ اس قصیدے کے آخری اشعار میں اپنا کچھ حال بھی بیان کر دیا ہے۔' غالبؔ

کو ۲۸ رفروری ۱۸۲۸ء اسٹرلنگ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ غالبؔ نے قصیدے کے کچھ اشعار پڑھ کر سنائے، جن سے اسٹرلنگ خوش ہوئے۔ سائمن فریزر اُن ہی کے ماتحت تھے۔ اسٹرلنگ طے کرتے تھے کہ کون سا مقدمہ کونسل کو بھیجا جائے اور کون سے مقدمے کو بنیادی مرحلے پر رَد کر دیا جائے۔ غالبؔ نے اُن سے اپنی ملاقات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسٹرلنگ کی گفتگو سے وہ اپنے مقدمے کے سلسلے میں بہت پُر امید ہو گئے تھے۔ اسٹرلنگ سے غالبؔ سے ہمدردی تھی لیکن وہ اصول و ضوابط کے سامنے معذور تھے۔ قانون کے مطابق اسٹرلنگ نے عرض داشت پر لکھا تھا کہ 'عرض داشت پہلے دہلی کے ریذیڈنٹ کے سامنے پیش کی جانی چاہیے تھی اور پھر وہاں سے اُن کے پاس آنی چاہیے تھی۔

غالبؔ نے جب یہ سنا کہ اراکینِ کونسل نے اُن کے مقدمے کو قبول کرلیا ہے لیکن یہ شرط لگادی ہے کہ 'عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کی معرفت آنی چاہیے۔ غالبؔ کو اس کی بہت خوشی تھی کہ اراکینِ کونسل نے اُن کا مقدمہ قبول کرلیا ہے لیکن اُن کو پریشانی تھی کہ اُنھیں اپنی عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کی معرفت بھیجنی ہوگی۔ غالبؔ نے پریشان ہو کر کہا کہ اوّل تو وہ مالی اعتبار سے اس قابل نہیں اور دوسرے اُن کی صحت بھی اتنے لمبے سفر کے لیے متحمّل نہیں ہو سکتی۔ اُنھیں جواب دیا گیا کہ آپ کلکتے ہی میں رہیں اور یہیں سے اپنے کاغذات ریذیڈنٹ کے پاس کاروائی کے لیے بھیجیں۔ اُن کے ذریعے وہ کاغذات کلکتے آجائیں گے۔

غالبؔ نے دہلی کے اپنے دوستوں میں سے ایک دوست مولانا فضل حق خیر آبادی کو خط لکھ کر اس سلسلے میں مدد مانگی۔ مولانا فضل حق نے غالبؔ کے لیے دہلی میں ایک وکیل پنڈت ہیرا لال کی خدمات حاصل کرلیں۔ غالبؔ نے فوراً ہی اپنا مختار نامہ متعلقہ وکیل کو بھیج دیا۔ کاغذات بھیجے ہوئے خاصے دن ہو گئے اور وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تو غالب

پریشان ہو گئے۔ غالبؔ نے عرض داشت اور متعلقہ کاغذات ایک ورق میں لپیٹے اور خود ڈاک خانے پہنچ گئے اور بقول غالبؔ، ’اُنھوں نے پوسٹ ماسٹر اور ڈاک خانے کے دوسرے عملے کو اس پر گواہ بنا کر لفافے کو اُن کی موجودگی میں لاکھ سے بند کیا‘۔ اس لفافے کا وزن دس روپے تھا اور قاعدے کے مطابق اس کا ڈاک محصول دس روپے بنا۔ غالبؔ اس خط کی رسید لے کر آ گئے۔ ابھی یہ خط پہنچا بھی نہیں ہوگا کہ مولوی فضل حق کا خط موصول ہوا، جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ ’اپنی مہر والا مختار نامہ بغیر رجسٹری کے نہ بھیجنا‘۔ غالبؔ نے جو خط بھیجا تھا، وہ غیر رجسٹری شدہ تھا، اس لیے اُنھوں نے اسٹامپ خریدا۔ اس پر مختار نامہ تحریر کیا اور رجسٹری کر کے دہلی بھیجا تھا۔ کچھ دن تک غالبؔ کو اس کا جواب نہیں ملا۔ وہ سخت مایوس تھے۔ قدم قدم پر ناکامیوں نے غالبؔ کو گھیر رکھا تھا۔ ابھی مقدمے کے معاملات چل ہی رہے تھے کہ غالبؔ کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل مع کونسل اور کونسل کے عملے کے افراد کے شمالی ہندوستان جا رہے ہیں۔ غالبؔ نے سوچا کہ گورنر جنرل اور اراکینِ کونسل کلکتے سے چلے جائیں گے تو وہ یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ بہتر تو یہی ہوتا کہ وہ بقول غالبؔ ’اُفتاں وخیزاں سر کے بل اس کارواں کے ساتھ جائیں لیکن اُن کے مالی حالات ایسے تھے کہ اُنھیں کلکتے ہی میں رہنا پڑا۔ کچھ دن بعد غالبؔ کو دہلی سے خط ملا کہ ’تمھارا مقدمہ مِسل کے کاغذات میں شامل ہو گیا ہے۔ غالبؔ اس فقرے کا مطلب نہیں سمجھے لیکن خوش امیدی نے اُنھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اُن کی عرض داشت مِسل پر لگ گئی ہے اور اب یہ مقدمہ شروع ہو جائے گا۔

غالبؔ کو خبر ملی کہ گورنر جنرل، افرادِ کونسل اور اشخاصِ عملہ ہندوستان جا رہے ہیں۔ تین سال کے لیے ضلع میرٹھ، جو دہلی کے قرب و جوار میں ہے، دارالسلطنت قرار پائے گا۔ حکومت نے طے کیا تھا کہ سارے متوسّلین، چاہے وہ وکیل ہوں یا درخواست گزار، سب کے سب اس قافلے میں ہم سفر اور ہم قدم ہوں گے۔ غالبؔ کی مشکل یہ تھی کہ سفر کے لیے

سازوسامان کہاں سے لاتے۔ غالبؔ سوچ رہے تھے کہ 'اگر مقدمے نے بہتری کی کوئی راہ پکڑلی ہوتی تو وہ اِعانت کے طور پر حکومت سے کچھ قرض لے لیتے۔'

پہلے یہ خبر آئی تھی کہ دہلی کے ریذیڈنٹ دورے پر چلے گئے ہیں لیکن اب پتا چلا کہ دوسری شعبان کو ریذیڈنٹ دہلی پہنچ گئے ہیں اور پانچویں شعبان کو غالبؔ کی عرض داشت اُن کی عدالت میں پیش ہوگی۔ ۱۷/اپریل ۱۸۲۹ء کو غالبؔ کو دہلی کے ریذیڈنٹ کا مہر کردہ خط موصول ہوا۔ خط کی عبارت تھی:

''خاں صاحب مہربان (خدا آپ کو سلامت رکھے) شوقِ ملاقات کے بعد واضح ہو کہ جناب عالی کا خط پینشن کے مطالبات کے بارے میں دوسرے منسلکہ کاغذ کے ساتھ پنڈت ہیرالال کے ذریعے موصول ہوا اور کاشفِ حال ہوا۔ مہربان! اس مقدمے میں ایک تحریر اہلیانِ صدر کے سامنے لکھ کر بھیج دی گئی ہے۔ ان مہربان کے جواب آنے پر آپ کو اطلاع دی جائے گی۔''

۱۷/اپریل ۱۸۲۹ء

دوسرے دن یعنی ۱۸/اپریل ۱۸۲۹ء کو غالبؔ گورنر جنرل سے ملاقات کے لیے گئے۔ غالبؔ نے ریذیڈنٹ کا خط اُنھیں دکھایا۔ اُنھوں نے یہ خط دیکھا اور اس سے پہلے کہ غالبؔ کچھ کہتے، اُنھوں نے کہا کہ 'تمھارے مقدمے میں کول بروک صاحب نے صدر دفتر کو جو خط لکھا تھا اُس کا یہاں سے مناسب جواب بھجوا دیا گیا تھا۔ گورنر جنرل نے یہ بھی کہا کہ ریذیڈنٹ آپ پر نظرِ عنایت رکھتے ہیں اور توقع ہے کہ آپ کے دعووں کی تشخیص اور تحقیق کر کے صدر دفتر کو رپورٹ بھیجیں گے۔ غالبؔ نے ایک دو دن بعد وکیل کے خط کا جواب اور دوسرے کاغذات ریذیڈنٹ دہلی کے منشی کو ڈاک سے بھجوا دیے۔

غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ 'میں نے کچھ سعی و تدبیر اور کچھ روپے کے زور سے دہلی کے ریذیڈنٹ کی رپورٹ کی نقل ضمیمۂ حکم کے ساتھ حاصل کر لی ہے۔'

اس دوران میں ایک اور حادثہ پیش آیا۔ دہلی کے ریذیڈنٹ کے خلاف اُس کے دشمنوں نے کچھ الزام تراشیاں کیں، اس لیے بقول غالبؔ، وہ فی الوقت اپنی خدماتِ مفوضہ انجام نہیں دے رہا ہے اور جب تک ان الزامات کی تحقیق مکمل نہیں ہوتی، یہی حال رہے گا اور اگر بے گناہ اور پاک نکلا تو اپنے عہدے پر بحال ہو جائے گا ورنہ کوئی دوسرا آدمی آ جائے گا۔' یہ ریذیڈنٹ کول بروک تھے۔ اُن کو برطرف کر کے فرانس ہاکنس کا تقرر کر دیا گیا۔ ہاکنس بقول غالب 'شکار دوست اور لاپرواہ تھا' غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کو خط لکھا کہ 'اگر آپ کسی ایسے انگریز کو جانتے ہوں کہ ہاکنس کا شناسا ہو تو ازراہِ کرم اُس سے ایک سفارشی خط لے کر مجھے بھیج دیجیے۔' پتا نہیں غالبؔ کی اس درخواست کا کیا ہوا۔

گورنر کا قافلہ بنارس تک پہنچ گیا تھا کہ قافلے کا کوچ اگلے سال تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ گورنر کے حکم پر سب لوگ کلکتے واپس آ گئے۔ غالبؔ نے دیکھا کہ فرانسس ہاکنس دہلی کے ریذیڈنٹ مقرر ہو گئے ہیں اور اب غالبؔ کا مقدمہ اُن کے ذمے ہوگا تو اُنھوں نے ہاکنس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور بقول غالبؔ 'ہاکنس کو پسند آیا' غالبؔ نے لکھا ہے کہ 'دہلی میں پہلی ہی ملاقات میں ہاکنس نے مجھ سے پورے ایک گھنٹے تک قصیدہ سنا، کلکتے کے خبروں کی پوچھ گچھ اور میری نالش کے دائر کرنے کے متعلق بات چیت کے بعد ملتفت ہوئے۔'

غالبؔ مسلسل یہ کہتے رہے کہ لارڈ لیک کے دستاویز جعلی ہے لیکن حکومت کے مختلف عہدے داران اس کے اصل ہونے پر اصرار کرتے رہے۔ جارج سوئنٹن معتمد اعلا برائے حکومت نے ۳۱/دسمبر ۱۸۳۰ء کو دہلی کے ریذیڈنٹ ولیم بائم مارٹن کوسی۔نورس کے خط کی نقل بھیجتے ہوئے لکھا کہ نورس کا خط پڑھنے سے آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ مدعی (غالبؔ) نے لارڈ لیک صاحب بہادر کے دستخط اور مہر سے جاری ہونے والے جس پروانے یا مراسلے کو جعلی قرار دیا ہے اُسے جناب سر جون میلکم نے صحیح دستاویز تسلیم کیا

ہے۔اس سب کے باوجود غالبؔ مستقل یہ کہتے رہے کہ لارڈ لیک والی دستاویز جعلی ہے۔
غالبؔ نے اپنے مقدمے کے بارے میں لکھا ہے:

''اپریل ۱۸۲۹ء میں میرے مقدمے کی رپورٹ دہلی سے صدر دفتر آ گئی۔اس مہینے میں اس کا جواب بھیج دیا گیا۔اتفاق یہ ہوا کہ صدر دفتر سے حکم کا پہنچنا، حاکم کی معزولی، دہلی کے ریذیڈنٹ اور دفتر کے اوراق کا بکھرنا۔یہ سب ایک ہی وقت میں ہوئے۔اس پراگندگی کی وجہ سے وہ خاص کاغذ غائب ہوگیا، جس پر اس سیہ بخت (غالبؔ) کی کامیابی کا دارومدار تھا۔منصف کے حکم پر دفتر کے لوگوں نے تمام دفتر چھان مارا۔ایک ایک کاغذ دیکھا مگر وہی کاغذ نہیں ملا۔دہلی کے ریذیڈنٹ کے سکریٹری نے مجھے بتایا کہ میں نے اس مقدمے کے بارے میں مرکز کو لکھا ہے اور اس حکم کا مثنیٰ طلب کیا ہے تاکہ وقت پر کام آ جائے اور کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آ جائے۔''

دہلی پہنچ کر انھوں نے دہلی کے ریذیڈنٹ سے رابطہ قائم کیا۔جب غالبؔ نے دیکھا کہ کلکتے میں مزید قیام سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو وہ ۲۰/۲۱/اگست ۱۸۲۹ء کو کلکتے سے روانہ ہو کر ۱۸/نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی پہنچ گئے۔

دہلی پہنچ کر انھوں نے دہلی کے ریذیڈنٹ سے رابطہ قائم کیا۔دہلی کے قائم مقام ریذیڈنٹ نے ۵/مئی ۱۸۳۰ء کے ایک خط میں گورنر جنرل کو اطلاع دی تھی کہ غالبؔ کی شکایت بے بنیاد ہے۔لارڈ لیک نے وظیفے کی جو رقم طے کی تھی وہ انھیں پابندی سے مل رہی ہے۔اس کے جواب میں چیف سکریٹری گورنمنٹ۔جی سوئنٹن نے دہلی کے قائم مقام ریذیڈنٹ ایف ہاکنز کو مئی ۱۸۳۰ء کے ایک خط میں لکھا کہ گورنر جنرل آپ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ اسد اللہ خاں کی شکایت بے بنیاد ہے۔

حکومت کے اس حتمی فیصلے کے باوجود غالبؔ ہمت نہیں ہارے۔اُنھوں نے جولائی ۱۸۳۰ء

کو گورنر جنرل کو ایک اور عرض داشت بھیجی، جس میں وہ تمام باتیں پھر دہرائیں جو خواجہ حاجی اور پنشن کی تقسیم کے بارے میں پہلی عرض داشت میں کہہ چکے تھے اور مقدمہ پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ اس دفعہ غالبؔ کو یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ غالبؔ کی عرض داشت پر گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹک نے ۲۰/اگست ۱۸۳۰ء کو دہلی کے قائم مقام ریذیڈنٹ ایف ہاکنز کو حکم دیا کہ لارڈ لیک کا ۷/جون ۱۸۰۶ء کا وہ خط جو نواب احمد بخش خاں کے نام لکھا گیا تھا اور جس میں نصر اللہ بیگ خاں کے ورثا کی پنشن کی رقم مقرر کی گئی تھی۔ نواب شمس الدین سے لے کر اُن کو بھیج دی جائے۔

ایف ہاکنز نے نواب صاحب سے یہ خط لے کر ۸/اکتوبر ۱۸۳۰ء کو گورنر جنرل کو بھیج دیا۔

۱۹/اگست ۱۸۳۰ء کو چیف سکریٹری برائے حکومت جی سوئنٹن نے ایک تفصیلی نوٹ لکھا جس میں غالبؔ کی پینشن کے تمام معاملات دہرائے۔ اس میں بہت سے سوالات اُٹھائے ہیں، جس میں سے چند درجِ ذیل ہیں:

۱۹/اگست ۱۸۳۰ء کو جی سوئنٹن معتمد اعلیٰ برائے حکومت نے ایک طویل نوٹ لکھا، جس میں مقدمے کے درجِ ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

کہ عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کو پیش کریں۔ (۲۰/جون ۱۸۲۸ء کو فریزر کے دستخط سے ایک حکم جاری ہوا کہ ''مدعی (غالبؔ) کو مطلع کیا جائے کہ یہ عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کے نام ہونی چاہیے)۔

لارڈ لیک کی ۷/جون ۱۸۰۶ء کی متنازعہ دستاویز ریکارڈ میں نہیں ہے۔

یہ واضح نہیں ہوتا کہ اصل دستاویز ہاکنز کو پیش کی گئی تھی یا نہیں۔

مجھے ۷/جون کا خط ملنا ضروری ہے۔ اس خط کے جائزے کے بعد اگر کچھ شکوک پیدا ہوں تو انھیں پریذیڈنسی میں بھیجا جائے۔

نواب شمس الدین نے ہاکنز کے مراسلے، جو گزشتہ ۵/مئی کو پیش کیا گیا تھا، میں بڑی غیر

سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ ان کی اس رائے سے کہ وہ (غالبؔ) ایک شاعر ہے اور شاعر کے اس استحقاق سے وہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے اور پورا فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اسداللہ خاں کے دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ہمیں مقدمے کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے۔

ہمیں احمد بخش خاں کو عطا کی گئی سند مورخہ ۴؍مئی ۱۸۰۶ء کا جائزہ لینا چاہیے جو اصل و حقیقی ہے اور گورنر جنرل صاحب بہادران کونسل نے اس کی توثیق کی تھی۔ اس کی ایک نقل سر جان میلکم کے اسی تاریخ کے مراسلے میں شامل ہے اور وہیں دیکھی جا سکتی ہے وظیفے کی مد میں حقیقتاً نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے لیے دس ہزار روپے رکھے گئے ہیں لیکن بدقسمتی سے جس ڈھیلے ڈھالے انداز میں ۴؍مئی ۱۸۰۶ء کی سند کو الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے اس میں ٹھیک ٹھیک رقم کا کوئی ذکر نہیں۔ زرِ استثنیٰ کو ایک مقررہ مقصد یعنی نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی کفالت اور گزراوقات کے لیے پچیس ہزار سے کم کر کے پندرہ ہزار کر دیا گیا ہے۔

اس میں کنایتاً مذکورہ بالا منہائیوں اور شرائط کا ذکر تو کیا گیا ہے لیکن منہائی اور شرائط کے الفاظ عمومی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ لارڈ لیک صاحب بہادر نے جو اس وقت کان پور میں تھے ۴؍مئی کو یہ پروانہ عطا کرنے اور اسی مہینے کی سولہ تاریخ کو حکومت کا جواب ملنے کے بعد جس میں جو کچھ کہا گیا تھا اس کی منظوری دی گئی تھی۔ احمد بخش خاں کو یہ بتانے کے لیے کہ گزشتہ مہینے کی سولہ تاریخ کو کیا طے پایا ۷؍جون کو دوبارہ خط لکھا ہو۔

نواب احمد بخش کی درخواست پر (جو اس وقت لارڈ لیک صاحب بہادر کی معیت میں کان پور میں تھے۔ لکھا کہ اگر لارڈ موصوف نے ۷؍جون کا خط لکھا تھا تو کرنل میلکم صاحب بہادر نے جنھوں نے چند روز بعد (۱۰؍جون) ۱۶؍مئی کے سرکاری احکامات کے وصول پانے کی اطلاع دی تھی، یہ رپورٹ کیوں نہ دی کہ احمد بخش خاں کو ایک خط ارسال کیا گیا ہے جس میں پانچ ہزار روپے کی ایک معینہ رقم نصراللہ بیگ خاں کے خاندان والوں کی کفالت کے

لیے مقرر کی گئی ہے اور ان اسباب کی وضاحت کی گئی ہے جن کی بنا پر زرِ استثنیٰ کی بقیہ رقم وظیفے میں دوبارہ شامل نہیں کی گئی جو نواب کی جاگیر سے ادا کی جاتی ہے؟ لیکن ایسی کوئی رپورٹ نہیں۔ اگر دستاویز اصلی ہے تو یہ بعید از قیاس نہیں کہ احمد بخش نے یہ فریب اور دھوکہ سے حاصل کی ہو لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ ایک ایسا حکم ہے جو لارڈ لیک صاحب بہادر نے اپنی رضامندی سے جاری کیا ہے تو کیا لارڈ موصوف اتنے بااختیار تھے کہ بغیر گورنر جنرل ان کونسل کے منظور کیے ہوئے کسی سابقہ فیصلے کو درہم برہم کرسکیں؟ اور کیا حکومت اس کی پابند ہوگی؟ مجھے یہ تصور بھی نہیں کرنا چاہیے اور خواہ یہ دستاویز اصلی ہو یا جعلی، ظاہر یہی ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے اقربا زیادہ وظیفے کے حق دار ہیں۔

اس نوٹ میں جن کاغذات کا حوالہ دیا ہے وہ حوالے کے لیے منسلک ہیں۔

(دستخط) جی۔ سوئنٹن

۱۹/اگست ۱۸۳۰ء

معتمد اعلیٰ برائے حکومت

(صحیح نقل)

(دستخط) جی۔ سوئنٹن

معتمد اعلیٰ برائے حکومت ہند

ادبی معرکے کے تین مشاعرے

غالبؔ کی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں مرزا افضل بیگ کی غالبؔ دشمنی کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی جاچکی ہے۔ غالبؔ نے کلکتے پہنچ کر صاحبِ اقتدار برطانوی افسروں سے تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ مرزا افضل بیگ کو محسوس ہوا کہ انگریزوں سے غالبؔ کے ان تعلقات کی وجہ سے ممکن ہے کہ یہ مقدمہ غالبؔ کے حق میں طے ہو جائے اور ان کی سگی بہن کے بچے پینشن کے حق سے محروم ہو جائیں۔ اس لیے مرزا افضل بیگ نے غالبؔ کے

خلاف وہ تمام حربے استعمال کرنے شروع کیے جن سے غالبؔ کی عزت اور وقار کو ٹھیس پہنچے اور پینشن کے مقدمے کا فیصلہ غالبؔ کے خلاف ہو۔

مرزا افضل بیگ اور اُن کے ٹولے کے بارے میں غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے

> ''یہ امر پوشیدہ نہ رہے کہ جب میں کلکتے پہنچا تو لوگوں کے گروہ میرے پیچھے پڑ گئے اور اُنھوں نے نکتہ چینی اور شرفا آزاری شروع کر دی بلکہ اُنھوں نے ایک ٹولا خاص طور پر (مجھے) پریشان کرنے کے لیے ترتیب دیا اور وہ آپس میں مل بیٹھے صرف اس لیے کہ میری مخاصمت پر اُٹھ کھڑے ہوں۔'' [1]

جب غالبؔ کلکتے پہنچے ہیں تو مرزا افضل بیگ اکبر شاہ ثانی کے وکیل کی حیثیت سے کلکتے میں موجود تھے۔ اُنھوں نے غالبؔ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ غالبؔ پر مختلف طریقوں سے حملے کیے گئے۔ مرزا افضل بیگ کے برطانوی افسروں سے اچھے مراسم تھے، اُنھوں نے غالبؔ کی پنشن کے بارے میں ان افسروں کو یقیناً بہکایا ہوگا۔ مرزا افضل بیگ نے غالبؔ پر ہر محاذ پر شکست دینے کی کوشش کی۔ بہ حیثیت شاعر غالبؔ کی ممتاز حیثیت تھی۔ اس حیثیت کو بگاڑنے کے لیے تین طریقے استعمال کیے گئے۔ کلکتے میں قتیلؔ کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے یہ افواہ پھیلائی گئی کہ غالبؔ قتیلؔ کو برا بھلا کہتے ہیں، جس کی وجہ سے حامیانِ قتیلؔ غالبؔ سے بدظن ہو گئے پھر یہ کہا گیا کہ غالبؔ سخنورانِ کلکتہ کو بے حیثیت گردانتے ہیں۔ ان الزامات کے سبب کلکتے کے شاعروں اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ غالبؔ کا مخالف ہو گیا، اس کی تفصیل آگے بتائی جائے گی۔

غالبؔ کی پینشن کے مقدمے کو بگاڑنے کے لیے دو خطرناک وار اور کیے گئے۔ یہ مشہور کر دیا گیا کہ غالبؔ اپنا نام اور تخلّص بدلتے رہتے ہیں۔'' [2] مرزا افضل بیگ اور اُن کے ہم نواؤں نے غالبؔ کے خلاف ہر طرح کا حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا اور غالبؔ کے پنشن کے مقدمے کو ہر ممکن طریقے سے بگاڑنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے مشہور کر دیا کہ غالبؔ

اپنا نام اور تخلّص بدلتے رہتے ہیں۔

اس الزام تراشی کا مقصد یہ تھا کہ کار پردازانِ دفتر کو نام کے جھگڑے میں ایسا اُلجھا دیا جائے کہ وہ غالبؔ کی درخواست ہی گورنر جنرل تک نہ پہنچائیں۔ چوں کہ غالبؔ مخالفین کے مقصد سے بخوبی واقف تھے اس لیے اُنھوں نے اپنی صفائی میں حکومت کو خط لکھا۔ اُنھوں نے اس پورے معاملے کے بارے میں ایک فارسی خط میں (خط پر) اُس سرکاری افسر کا نام نہیں ہے جسے خط لکھا گیا ہے) غالبؔ لکھتے ہیں:

''مخفی نہ رہے کہ جب میں کلکتے پہنچا تو ایک بدطینت اور میرے وطن کا ستم گر (مرزا افضل بیگ) میرے کلکتے پہنچنے سے پہلے دہلی سے یہاں آ چکا تھا اور اربابِ حکومت سے تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے میرے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیا کہ دہلی سے اس تازہ وارد مصیبت کے مارے نے (کلکتے پہنچ کر) اپنا نام اور تخلص دونوں بدل لیے ہیں جس کی وجہ سے دفتر کے کارکنوں کو سربراہ (گورنر جنرل) کے سامنے میرے معاملے کو پیش کرنے میں تامل ہوا۔ سات سال سے زیادہ مدت ہوئی کہ میں نے اپنا دیوانِ ریختہ مرتّب کیا تھا۔ اس دیوان کے آخر میں میرے نام کی ایک مہر ثبت تھی۔ مہر پر ''اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ۔ ۱۲۳۱ھ کندہ تھا۔ دشمنوں کا منہ بند کرنے کے لیے یہ مہر کافی تھی۔ میں نے سرکاری دفتر کے افسرِ اعلا کے پاس یہ دیوان بھیج دیا اور یہ خط ساتھ بھیجا۔

قبلۂ سعی ستم رسیدگان۔ سلامت

شیوۂ جانفشانی کے اظہار کے بعد گزارش ہے کہ میرے اسم و علم کے سلسلے میں جو تفرقہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اس ننگِ آفرینش کے لیے باعثِ شرم بھی ہو سکتا ہے لیکن کیا کیا جائے پریشانیوں میں پریشانیاں پیدا ہو رہی ہیں...... سبحان

اللہ دو سو فرسنگ سے تلوار کی دھار پر سفر کرتا ہوا اور شرکا کے ظلم وستم کے خلاف فریاد کرتا ہوا عدالتِ انصاف میں حاضر ہوا ہوں۔ اگر یہاں سے لعنت کا طوق گردن میں ڈال کر اور ملامت کے سنگریزے دامن میں بھر کر واپس جاؤں تو میرے بعد یہاں کے لوگ کہیں گے کہ فلاں زمانے میں ایک ایسا گمنام اور مجہول الاحوال شخص اس عظیم شہر میں آیا تھا جو ہر سال نیا تخلّص اختیار کرتا تھا اور ہر مہینے اور ہر ہفتے اپنا نیا نام رکھ لیتا تھا۔ میرا دیوان اور پرانی غزلوں کے مقطع دیکھے جائیں۔ مدعی کو خاموش کرنے کے لیے یہ کافی ہیں۔ وللہ بغیر بالعباد۔ میرے دوسرے دیوان کے خاتمے پر میرے نام کی مہر...... جو اُن اوراقِ پریشان پر ثبت ہے۔ خاص طور سے بغور دیکھی جائے۔ یہ مہر بھی...... اس گفتگو میں تیغِ دودم کی حیثیت رکھتی ہے۔ مہر میں کندہ میرا نام مخالفوں کے منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ بھی ثابت کرنے کے لیے یہ مہر کافی ہے کہ اس گمنام نے مستقل طور پر اپنے نام کو قبول کیا ہے یا نہیں...... حقیقت یہ ہے کہ اس فقیر کا نام اسد اللہ خاں ہے، عرف مرزا نوشہ اور تخلّص غالبؔ ہے لیکن چوں کہ لفظِ 'غالب' میں چار حروف ہیں اس لیے بعض مصرعوں میں یہ تخلّص نہیں آسکتا اس گناہ گار کا اسمِ مخفف 'اسد' ہے۔ یہ سہ حرفی لفظ ہے اس لیے کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر 'اسد' بھی بطور تخلّص استعمال کر لیتا ہوں۔ اگر یہ غلطی ہے تو معافی چاہتا ہوں اور اگر جائز ہے تو انصاف کا طالب ہوں۔

توقع ہے کہ میری اس گزارش کے بعد نام تبدیل کرنے کا کمینے پن کا داغ میرے دامن سے دُھل جائے گا۔''[۳۳] (فارسی سے آزاد ترجمہ)

یہی نہیں بلکہ مذہبی محاذ پر بھی غالبؔ پر حملے کیے گئے۔ بقول غالبؔ:

''مرزا افضل بیگ میرے ساتھ پوشیدہ دشمنی رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اہل سنت میں مجھے کٹر رافضی اور اہلِ تشیع میں صوفی و ملحد و زندیق مشہور کر دیا۔'' (فارسی سے ترجمہ)[۴]

مرزا افضل بیگ کا مقصد یہ تھا کہ سنّی و شیعہ دونوں فرقے غالبؔ کے خلاف ہو جائیں اور بنیادی مدعا وہی تھا جو پہلے بیان کیا گیا یعنی برطانوی حکومت کے افسران کو غالبؔ سے بدظن کر دیا جائے لیکن مرزا افضل بیگ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ غالبؔ، نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''لیکن خدا کی قسم اس نے (مرزا افضل بیگ) میرے کام میں جو بھی رخنہ ڈالا وہ میرے لیے روزنِ نجات بن گیا۔ کیا کہوں کہ فریزر صاحب سے ملاقات کے وقت اس کے بارے میں...... مولوی عبدالکریم صاحب سے کیسی کیسی غلط بیانیاں ہوئیں، لیکن علی ابنِ ابی طالب کے اعجاز پر نازاں ہوں کہ میرے ساتھ ملاقات میں (بہت اچھی طرح پیش آئے) مجھے رخصت کرنے کے لیے آئے۔ مجھ سے بغل گیر ہوئے، عطر اور پان پیش کیا، جو رسمِ ملاقات کے انتہائی معمولی اور عمومی آداب ہیں بجالائے۔''[۵] (فارسی سے ترجمہ)

یہ حالات دیکھ کر مرزا افضل بیگ نے ایک اور حربہ استعمال کیا جس کی وجہ سے غالبؔ کو سخت ترین پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مشاعروں میں غالبؔ کو شرکت کی دعوت دی گئی جن میں فارسی اور اردو کے اس ہمیشہ زندہ رہنے والے عظیم شاعر کو بہت معمولی لوگوں کے ہاتھوں رسوا اور بے آبرو کرایا گیا۔ مرزا افضل بیگ اور اُن کے گروہ کے لوگوں نے غالبؔ کو شعر و ادب کے نہیں بلکہ غنڈہ گردی کے میدان میں شکست دی۔ ان معاملات نے غالبؔ کی اَنا کی لَے کو اتنا تیز کر دیا کہ غالبؔ نے اپنے بعض مربّیوں اور دوستوں کے نام خطوط میں اس ادبی

معرکے کے سلسلے میں جو واقعات بیان کیے ہیں ان میں غم و غصّے کی وجہ سے کہیں تو غالبؔ کی یادداشت نے دھوکا دیا ہے، کہیں غالبؔ نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور کہیں اپنی اَنا کی وجہ سے حقیقت سے روگردانی کرتے ہوئے بے بنیاد اور بے اصل باتیں کہیں ہیں۔ دوسروں اور خاص طور سے سفیرِ ہرات کی زبانی اپنی تعریف کرائی ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مرزا افضل بیگ نے غالبؔ کو عوام و خواص کی نظر میں کم علم ثابت کرنے کے لیے مشاعرے کا حربہ استعمال کیا تھا۔

ادبی معرکے کے سلسلے میں تین مشاعرے ہوئے تھے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں ان مشاعروں میں ہونے والے واقعات کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس مشاعرے میں کیا واقعہ رونما ہوا اور کون سا مشاعرہ کس تاریخ کو منعقد ہوا۔ یہ خطوط بار بار پڑھنے کے بعد میں نے مشاعروں کی جو تاریخیں متعیّن کی ہیں وہ ہیں:

پہلا مشاعرہ یکم جون ۱۸۲۸ء

دوسرا مشاعرہ ۸؍جون ۱۸۲۸ء

تیسرا مشاعرہ ۱۵؍جون ۱۸۲۸ء[6]

کس مشاعرے میں کیا واقعہ رونما ہوا۔ غالبؔ کے خطوط کی بنیاد پر اس کا تعیّن بھی میں نے خود کیا ہے۔

پہلا مشاعرہ

ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل وارن ہٹینگز نے کلکتے میں ۱۷۸۱ء میں مدرسۂ عالیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ ۱۸۲۰ء میں اس مدرسے کی ازسرِ نو تشکیل ہوئی۔ مدرسہ اُس عمارت میں منتقل کردیا گیا جو ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے ویلزلی اسکوئر کی شمالی جانب تعمیر کی گئی تھی۔''

سیّد اکبر علی ترمذی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ غالبؔ کی آمد سے پہلے ہی مدرسۂ عالیہ علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا، کلکتے کے دانش وروں نے ایک انجمن قائم کی تھی جس

کے زیرِ اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو اس مدرسے میں مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ غالبؔ نے ادبی معرکے کے سلسلے میں جس پہلے مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ وہ یکم جون ۱۸۲۸ء کو مدرسۂ عالیہ میں منعقد ہوا تھا۔

نواب محمد علی خاں کے نام پہلے مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے غالبؔ نے لکھا ہے:

> ''اس شہر کے نکتہ رس اور سخن ور افراد نے اس خاکسار کے ورود سے پہلے ہی ایک انجمن بنا رکھی ہے۔'' ہر ماہ انگریزی شمسی کے پہلے یک شنبہ کو یہ اہلِ قلم اور مدرسۂ کمپنی بہادر کے ادبا اور اہلِ علم یہاں جمع ہوتے ہیں اور ہندی و فارسی غزلیں پڑھتے ہیں۔''[۷] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ نے ایک خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''مجھے خاص طور سے ذلیل کرنے اور نقصان پہنچانے کے لیے ایک انجمن تشکیل دی۔ ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ کلکتے کے شاعروں کو مدعو کیا اور مجھے بھی دعوت دی۔ ریختہ گو شعرا کو اردو کا اور فارسی گو شعرا کو فارسی کا مصرعۂ طرح بھیجا اور مجھے دونوں زبانوں کے مصرعے بھیجے۔ جون کے مہینے کے پہلے اتوار کو یہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں نے دونوں زبانوں میں طرحی غزلیں پڑھیں۔ خواص اور عوام دونوں نے میرا کلام پسند کیا۔ اہل انصاف کے ایک گروہ نے کہا کہ جس کی فصاحت کا یہ حال ہو، اس کے مقابلے میں قتیلؔ کیا ہے بلکہ پچھلے شاعروں میں مثلاً اسیرؔ اور اس مرتبے کے دوسرے شاعروں سے غالبؔ ہم سری کا دعویٰ کرے تو کچھ غلط نہیں۔ بلکہ یہ دعویٰ غالبؔ کو زیب دیتا ہے۔ مجھے خدا پر ناز ہے کہ جو ہنگامہ مجھے رسوا اور بے آبرو کرنے کے لیے کیا گیا تھا وہ میری شہرت اور اظہارِ کمال کا ذریعہ بن گیا۔''[۸] (فارسی سے ترجمہ)

دوسرا مشاعرہ

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ پہلے مشاعرے میں عوام و خواص دونوں نے غالبؔ کا کلام پسند کیا۔ بقولِ غالبؔ:

''دوسری صحبت (مشاعرہ) کے لیے حکیم ہمام کی غزل کا ایک مصرع، مصرع طرح کے طور پر دیا گیا۔ اس غزل کا پہلا مطلع ہے:

درمیانِ من و دلدار ہمام است حجاب
دارم امید کہ آں ہم ز میاں برخیزد'' [9]

(فارسی سے ترجمہ)

یہ مشاعرہ ۸؍ جولائی ۱۸۲۸ء کو مدرسۂ عالیہ میں منعقد ہوا۔ بقولِ غالبؔ:

''دس بارہ اشعار میں نے بھی اسی ردیف قافیے میں لکھے اور مشاعرے میں پڑھے۔'' [10] (فارسی سے ترجمہ)

مشاعرے میں تو سامعین نے خاموشی سے غالبؔ کی غزل سن لی۔ وہاں کسی نے اعتراض نہیں کیا لیکن مخالفین تاک میں رہے۔ ایک ہفتے بعد بقول غالبؔ:

''اطلاع ملی کہ کسی بے وقوف نے ان اشعار میں سے ایک شعر پر نکتہ چینی کر کے خود کو اربابِ ذوق کی نظر میں رسوا کیا ہے۔'' [11] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ کا شعر ہے:

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

''اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ 'عالم' کلمۂ مفرد ہے، اس کے ساتھ لفظ 'ہمہ' کی ترکیب درست نہیں ہے اور وہ اس وجہ سے کہ 'عالم' بذاتِ خود مجموعۂ اشیا ہے اور 'چہار شربت' اور 'نہر الفصاحت' میں اس (ترکیب) کی نشان دہی نہیں کی

گئی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ لفظ 'بیش' تا وقتے کہ اس کے بعد 'تر' نہ لائیں، استعمال نہیں ہوتا۔ چناں چہ مناسب نہیں ہے کہ اس کو (تنہا) لکھا جائے 'بیش تر' کہنا چاہیے، 'بیش' تنہا نہیں کہا جا سکتا۔ مزید یہ کہ معشوق کی کمر پر بالوں کا اُگنا عقلاً اور عادتاً...... (قیاسی: محال ہے) دیگر یہ کہ بالوں کے یا سبزے کے اُگنے کو 'برخاستن' نہیں کہا جا سکتا۔''[۱۲] (فارسی سے ترجمہ)

تیسرا مشاعرہ

غالبؔ نے لکھا ہے کہ جب میں نے ان اعتراضات پر نظر ڈالی اور معترض کی علمی حیثیت کو جانچا (قیاسی: تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس نالائق کے منہ لگنا) اور اس سے گفتگو کی زحمت اُٹھانا میرے لیے جائز نہیں۔

۱۵/جون ۱۸۲۸ء کو تیسرا مشاعرہ منعقد ہوا۔ غالبؔ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کم علم معترض کے منہ نہیں لگیں گے لیکن غالباً تیسرے مشاعرے میں بھی ان پر اعتراض کیے گئے 'ہمہ عالم' کی ترکیب پر اعتراض کرتے ہوئے کسی نے کہا کہ قتیلؔ کی تصانیف 'چہار شربت' اور 'نہر الفصاحت' میں یہ نہیں بتایا گیا کہ 'عالم' کلمہ مفرد ہے، اس لیے اس کے ساتھ 'ہمہ' کی ترکیب درست نہیں ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق کسی نے غالبؔ کا قتیلؔ سے پہلی بار موازنہ کیا تھا۔ یہ بات غالبؔ کو اتنی ناگوار گزری کہ زندگی بھر دل سے نہیں نکلی۔ اس طرح کے اعتراضات سے غالبؔ خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور بقول غالبؔ:

''یہ گفتگو کرتے ہوئے میرے نطق کا گھوڑا بدکا اور اس نے میدانِ حق جوئی میں فتنے کی گرد اُڑا دی۔''[۱۳] (فارسی سے ترجمہ)

پھر غالبؔ لکھتے ہیں:

''لیکن چوں کہ حق کی حمایت کرنا اور حق کے لیے جنگ کرنا ہر ایک متنفس کے

لیے فطری امر ہے۔ مجھے بھی قدرے غصہ آگیا اور میں مشاعرے کے تیسری نشست میں ان اعتراضات کا جواب دینے پر آمادہ ہوگیا۔'' [14]

(فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ نے کہا کہ ہمہ عالم کی ترکیب بالکل درست ہے۔ اسی طرح 'بیش' اور 'برخاست' کا استعمال بھی غلط نہیں ہے۔

غالبؔ اسی خط میں لکھتے ہیں کہ:

''چناں چہ وہ چند اشعارِ اساتذہ جو میں اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے تھے اب بھی مجھے یاد ہیں۔'' (فارسی سے ترجمہ)

ان اشعار میں سے ایک شعر حافظ علیہ الرحمتہ کا ہے، جو لفظ 'ہمہ' اور 'عالم' کی ترکیب کی نشان دہی کرتا ہے:

گر من آلودہ دامنم چہ عجب
همہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

دوسرے ایک مطلع ہے مصلح الدین سعدی علیہ الرحمۃ کا:

بہ جہاں خرّم از آنم کہ جہاں خرّم ازوست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم ازوست

ایک اور شعر حضرت نورالدین جامی علیہ الرحمتہ و الغفران کا ہے جو مکمل طور پر بغیر 'تر' کے لفظ 'بیش' کے استعمال کا جواز ہے:

کم از آنم کہ درِ معذرتم باید زد
بیش از آنی کہ دہی خجلتِ تقصیر مرا

ایک اور شعر بھی (کسی) استاد کا ہے، جو 'برخاستن' اور 'روئیدن' کے ہم معنی ہونے کے اثبات میں ہے چناں چہ شاعر کہتا ہے:

از رخ، خطِ مشک سود برخاست

آتش بہ نشست و دود برخاست"

غالبؔ نے مرزا احمد بیگ طپاںؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"نوازش نامہ پہنچا اور اس نے میری عاجزی کی آبرو بڑھا دی۔ تینوں مطلعوں کو میں نے اپنے دعوے کے جسم کی روح سمجھتے ہوئے محفوظ کرلیا ہے۔ خیال ہے کہ چند روز ٹھہر کر محفلِ مشاعرہ میں بلند آواز سے پڑھے جائیں تاکہ اہلِ محفل بھی سن لیں اور اعتراض کرنے والے کی رسوائی اور معترض کی گراں رتبگی ان پر ظاہر ہو جائے۔"[15] (فارسی سے ترجمہ)

طپاںؔ نے غالباً اساتذہ کے ایسے تین اشعار لکھ کر بھیجے تھے، جنھیں غالبؔ مخالفین کے سامنے اپنی دِفاع میں سند کے طور پر پیش کر سکتے ہوں۔

بیشتر ماہرینِ غالبؔ نے جن میں مالک رام صاحب بھی شامل ہیں، لکھا ہے کہ 'جب غالبؔ نے برخیز دوالی غزل پڑھی تو کچھ سامعین نے اعتراضات کیے۔ بقول مالک رام صاحب:

"اس پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ مصرعِ اولیٰ میں 'بیش' کی جگہ (بیشتر) ہونا چاہیے تھا۔ برابر سے ایک دوسرے صاحب بول اُٹھے کہ مصرع ثانی میں 'موے زمیاں' کی ترکیب غلط ہے بلکہ پورا شعر بے معنی ہے۔ ایک اور صاحب نے 'ہمہ عالم' کی ترکیب پر فرمایا کہ 'عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ حسبِ اجتہادِ قتیلؔ ممنوع ہے۔

غالبؔ نے ایک اور غزل بھی پڑھی تھی۔ اس میں شعر ہے:

شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم

طعنہ بر بے سروسامانِ طوفاں زدہ[16]

مالک رام صاحب بہت محتاط محقق تھے۔ اتفاقاً غالبؔ کے ایک خط کی عبارت پر اُن کی نظر نہیں

گئی۔ غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''ایک ہفتے بعد کسی نا اہل یا نالائق نے میرے ایک شعر پر اعتراضات کیے۔ اس کا مطلب ہے کہ غالبؔ کی غزل پر اعتراضات اس مشاعرے (دوسرا مشاعرہ) میں نہیں کیے گئے تھے بلکہ مشاعرے کے ایک ہفتہ بعد کیے گئے تھے' شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم۔'' والی غزل غالبؔ نے تیسرے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ اس کے ایک شعر پر اسی مشاعرے میں اعتراض کیا گیا تھا۔

غالبؔ نے لکھا ہے:

''پہلے اُنھوں نے یہ مشہور کردیا کہ ''زدہٗ'' کے کسرے کو مضاف الیہ کی ضرورت ہے۔ جب انھیں جواب ملا کہ زدہٗ میں کسرہ اضافی نہیں بلکہ یاے وحدت ہے تو وہ دم بخود ہوگئے اور کہنے لگے (زدہٗ) میں 'ہمزہ' ہمیشہ مفعول میں آتا ہے لیکن یہاں مفعول کے معنی میں نہیں آیا ہے۔''

غالبؔ نے اپنی مثنوی 'بادِ مخالف' میں بھی اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں تیسرے مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے غالبؔ لکھتے ہیں:

''محفل اختتام کو پہنچی اور ہر شخص اپنے اپنے گھر چلا گیا۔ اس مکان میں جو لوگ موجود تھے۔ کیا شاعر اور کیا غیرِ شاعر، سب نے شور مچانا شروع کردیا اور میرے خلاف ہنگامے پر اُتر آئے اور انھیں میری شکست میں اپنی فضیلت نظر آئی اور وہ میری غزل کا ایک شعر لے بیٹھے اور نکتہ چینی اور ناانصافی کی داد دینے لگے۔ شعر یہ ہے:

شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سر و سامانیٔ طوفاں زدہٗ''

غالبؔ کے خطوط سے ہنگامہ کرنے والوں میں صرف ایک آدمی کے نام کا پتا چلتا ہے اور وہ

ہیں مرزا افضل بیگ۔ قریبی رشتے دار ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے غالبؔ کے سامنے آکر اعتراضات نہیں کیے اور غالباً کبھی کوئی گستاخی بھی نہیں کی۔ غالبؔ کے خطوط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہنگامہ کرنے والوں میں کئی لوگ شامل تھے اور بقول غالبؔ:

''وزیر اور رُخ تو پیچھے رہے اور پیدلوں کو آگے کر دیا گیا'' (فارسی سے ترجمہ)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان ہنگامہ کرنے والوں کے سلسلے میں لکھا ہے: [۱۷]

''کلکتہ میں یہ ہنگامہ جن لوگوں نے برپا کیا تھا، میں ان کے نام معلوم کرنا چاہتا تھا مگر بجز دو تین کے معلوم نہ ہو سکے۔ ایک صاحب احمد علی گوپاموٴ کے پرنس غلام محمد (میسور) کے یہاں میر منشی تھے۔ 'حملۂ حیدری' کا اُنھوں نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ دوسرے صاحب ان ہی کے ہم نام مولوی احمد علی مدرسہ عالیہ میں مدرس اور ایشیاٹک سوسائٹی کی فارسی عربی مطبوعات کے مصحح تھے۔ تیسرے ایک صاحب مولوی وجاہت علی لکھنوی گورنر جنرل کے دفتر انشا میں ملازم تھے۔ ان لوگوں نے صرف اعتراضات ہی نہیں کیے تھے بلکہ تحریرات بھی لکھی تھیں اور بعض تحریرات 'جامِ جہاں نما' نے جو فارسی کا ہفتہ وار اخبار تھا، چھاپ دی تھیں، وجاہت علی، قتیلؔ کے شاگرد اور وجاہت تخلص کرتے تھے۔'' [۱۸]

دل چسپ بات یہ ہے کہ 'ہمہ عالم' کے سلسلے میں جس سند کا حوالہ پیش کیا گیا تھا۔ وہ سید اسد علی انوری فرید آبادی کی تحقیق کے مطابق قتیلؔ کی تصنیفات میں تلاش کے باوجود نہیں ملا۔ معترض نے محض اپنے اعتراض میں وزن پیدا کرنے کے لیے قتیلؔ کے نام سے سند پیش کی تھی، جس کا مطلب ہے کہ غالبؔ زندگی بھر بے قصور قتیلؔ کو اس غلطی کی بنیاد پر سزا دیتے رہے جو قتیلؔ سے سرزد ہی نہیں ہوئی تھی۔'' [۱۹]

قتیلؔ کا نام آتے ہی غالبؔ بھڑک اُٹھتے اور دشنام طرازی کی تمام مہذب حدوں کو پار

کر جاتے۔

'غالب اور قتیل' کے عنوان سے علاحدہ باب میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مخالفین نے غالبؔ پر چوطرفہ حملہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ:

> ''(مخالفوں) نے صرف اعتراضات ہی نہیں کیے تھے بلکہ تحریرات بھی لکھی تھیں اور بعض تحریرات 'جامِ جہاں نما' نے جو فارسی کا ہفتہ وار اخبار تھا، چھاپ دی تھیں۔''[۲۰]

غالبؔ نے مرزا احمد خاں تپاںؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ ''اُن مخالفوں نے غالبؔ کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ جب وہ بازار سے گزرتے تھے تو مخالفین اُن پر آوازیں کستے تھے۔''

نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ غالبؔ کے ایک **کرم فرما** کو یہ شبہ ہوا کہ کہیں مخالفین غالبؔ کو جسمانی زک نہ پہنچائیں۔ اس لیے انھوں نے غالبؔ سے کہا کہ وہ اپنی قیام گاہ چھوڑ کر اُن کے گھر آ جائیں۔ مگر غالبؔ کو یہ منظور نہیں تھا۔

اگست تا اکتوبر ۱۸۲۸ء کے دوران غالبؔ نے کلکتے کے اپنے ایک مربّی سراج الدین احمد کو خط لکھا ہے۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج الدین احمد کو خیال تھا کہ مخالفین کی وجہ سے غالبؔ سخت ذہنی کرب کے شکار ہیں اور ممکن ہے سراج الدین احمد کو یہ ڈر بھی ہو کہ کہیں مخالفین غالبؔ کو جسمانی زک نہ پہنچائیں۔ اس لیے ایک دن اُنھوں نے غالبؔ سے کہا کہ وہ کلکتے میں شملہ بازار کا مکان چھوڑ کر اُن کے گھر منتقل ہو جائیں۔ غالبؔ کو یہ منظور نہیں تھا۔ اُنھوں نے دوسرے دن سراج الدین احمد کو خط لکھا، جس میں معذرت کی کہ وہ اُن کے گھر منتقل نہیں ہونا چاہتے۔

مخالفین نے عرصے تک غالبؔ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بہت چھوٹی اور رکیک حرکتیں کی جاتی

رہیں لیکن ایک چھوٹی حرکت یہ تھی کہ 'جامِ جہاں نما' میں غالبؔ کی پینشن کے مقدمے کے بارے میں ایسا خط چھاپا گیا جس کا مقصد غالبؔ کو نقصان پہنچانا تھا۔

'جامِ جہاں نما' کا وہ شمارہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں اس کا علم نہیں کہ اس اخبار میں غالبؔ کے خلاف کیا شائع ہوا، کس کے نام سے خط چھپا اور کب؟ ہاں، غالبؔ نے 'جامِ جہاں نما' کے اڈیٹر کو جو خط لکھا تھا، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کی پینشن کے مقدمے کے بارے میں لکھا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ غالبؔ کا دعویٰ غلط ہے۔ غالبؔ نے 'جامِ جہاں نما' میں اپنے خلاف شائع ہونے والی تحریر کے بارے میں ایک فارسی خط میں لکھا ہے:

> ''آج کی تازہ خبر یہ ہے کہ 'جامِ جہاں نما' دیکھا۔ (اس میں میرے خلاف جو کچھ چھپا ہے) اُس سے سوائے بے آبروئی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ آپ نے بھی وہ اوراق ملاحظہ کیے ہوں گے۔ واللہ باللہ ثم تا اللہ مجھ مسکین کے بارے میں اُن اوراق میں جو کچھ مندرج ہے، وہ سب محض جھوٹ، بہتان اور الزام تراشی ہے۔'' (ترجمہ) [۲۱]

اب وہ خط ملاحظہ کیجیے جو غالبؔ نے 'جامِ جہاں نما' کو لکھا تھا۔ خط کے پہلے فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ 'جامِ جہاں نما' کے اڈیٹر سے واقف نہیں تھے، اس لیے انھوں نے ادارے میں کام کرنے والوں کو مخاطب کیا ہے۔

> ''جامِ جہاں نما'' کے اوراق کو خوب صورت بنانے والے حضرات کے ذہن میں انصاف کے طالب اسد اللہ خاں کی یہ گزارش ذہن میں رہے کہ یہ ننگِ آفرینش کہ جو اسد اللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ متخلص بہ غالبؔ سونک سونسا کے جاگیردار نصر اللہ بیگ خاں کے بھائی کا بیٹا ہے۔ سرکارِ انگریزی سے اُسے جو حق (پینشن) ملا ہے، اُسے فیروز پور کے جاگیردار سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صدر والا کے حکم کے مطابق ریذیڈنسی کے اور وہ غلط خبریں شائع

ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں پورے شہر سے جھگڑا نہیں کر سکتا اور لوگوں کو اپنے حال سے آگاہ نہیں کر سکتا۔

اس ستاروں سے بھرے آسمان کا کیا کروں کہ یہ تو میرا زبردست دشمن ہے۔ مجبور ہو کر دشمنوں کے شان و شوکت سے پناہ مانگتا ہوں اور 'جامِ جہاں نما' کے ذمے داران سے چاہتا ہوں کہ بے کسوں کی سرپرستی کریں اور 'جامِ جہاں نما' میں منسلکہ چند سطریں شائع فرمادیں اور آئندہ ہوش حواس سے اس گمنام کے بارے میں دہلی سے کوئی خبر پہنچے تو اسے نظر انداز کر دیں اور اسے شائع نہ کریں۔ یہ درخواست ہمیشہ کے لیے ہے اور مجھے اس التماس میں بہت زیادہ اِصرار ہے۔''

حاشیے

غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی سفر

۱۔ مالک رام، فسانۂ غالب، (مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۱ء) ص ۱۱۳۔

۲۔ غالب کی خاندانی پنشن، ص ۲۸-۲۹۔

۳۔ سہ ماہی افکار (کراچی، غالب نمبر، ۱۸۶۹ء)، ص ۲۹۔

۴۔ غالب کی خاندانی پنشن، ص ۲۹۔

۵۔ فسانہ غالب، ص ۱۰۔

۶۔ نامہ ہائے فارسی غالب (مرتبہ پرتو روہیلہ)، (مترجم)، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۸۹۔

۱۔ غالب کان پور اور لکھنؤ میں

۲- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۳۰

۳- مختارالدین احمد، غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب، مشمولہ سہ ماہی اردو ادب، دلی گڑھ۔

۴- پنج آہنگ۔

۵- غالب کی خاندانی پنشن۔

۵الف- نامہ ہائے فارسی غالب (کراچی ۱۹۹۹) ص ۸۹-۹۹۔

۶- نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۳۲-۳۳۔

غالب کا باندہ، الہ آباد، بنارس اور مرشد آباد کا سفر

۱- محمد مشتاق شارق، غالب اور تبدیل کھنڈیل، (مشمولہ سہ ماہی تحریر، اپریل، جون ۱۹۷۷ء ص ۳۔

۲- باندہ اور غالب، صالحہ بیگم قریشی، باندہ ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۔

۳- غالب کے خطوط، ص ۳ (مرتبہ خلیق انجم)، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۰) ص ۳۔

۴- باندہ اور غالب: ۲۵-۲۶۔

۵- باندہ اور غالب: ۵۲۔

۶- غالب کی خاندانی پنشن: ۳۰۔

۷- غالب کی خاندانی پنشن: ۳۰۔

۸- غالب اور باندہ: ۷۴-۷۵۔

۹- غالب اور باندہ: ۴۱۔

۱۰- نامہ ہائے فارسی غالب: ۴۱۔

۱۱- نامہ ہائے فارسی غالب: ۱۶-

۱۲- نامہ ہائے فارسی غالب: ۴۱۔

۱۳- ذکر غالب: ۶۷۔

۱۴- نامہ ہائے فارسی غالب: ۱۱۸۔

۱۵- نامہ ہائے فارسی غالب: ۱۲۳۔

۱۶- نامہ ہائے فارسی غالب: ۲۰۔

۱۷- نامہ ہائے فارسی غالب: ۲۰۔

۱۸- اوراقِ معنی (مترجم ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی ۱۹۹۲) ص ۶۷-۶۸۔

۱۹- نامہ ہائے فارسی غالب: ۲۳-۲۴۔

۲۰- قاضی عبدالودود، کچھ غالب کے بارے میں (حصہ اوّل، پٹنہ، ۱۹۹۵ء) ۲۲۰۔

۲۱- پنج آہنگ: ۳۴۱-۳۴۲۔

غالب کلکتے میں

۱- نامہ ہائے فارسی غالب: ۲۶۔

۲- پنج آہنگ: ۳۵۸۔

۳- قاضی عبدالودود، مآثر غالب (پٹنہ، ۱۹۹۵ء) ۲۸-۲۹۔

۴- محمد علی کے نام ایک خط میں غالب نے اس مکان کا کرایہ دس روپے ماہوار بنایا ہے۔

ادبی معرکے کے تین مشاعرے

۱- نامہ ہائے فارسی غالب: ۱۵۷۔

۲- نامہ ہائے فارسی غالب: ۳۴-۳۵۔

۳- نامہ ہائے فارسی غالب:۱۰۲-۱۰۳۔

۴- نامہ ہائے فارسی غالب:۴۰۔

۵- نامہ ہائے فارسی غالب:۹۰۔

۶- نامہ ہائے فارسی غالب:۵۵۔

۷- نامہ ہائے فارسی غالب:۹۲۔

۸- نامہ ہائے فارسی غالب:۹۲۔

۹- نامہ ہائے فارسی غالب:۱۵۷۔

۱۰- نامہ ہائے فارسی غالب:۱۵۷۔

۱۱- نامہ ہائے فارسی غالب:۱۵۷۔

۱۲- نامہ ہائے فارسی غالب:۱۵۷-۱۵۸۔

۱۳- نامہ ہائے فارسی غالب:۱۵۸۔

۱۴- نامہ ہائے فارسی غالب:۱۵۹۔

۱۵- پرتو روہیلہ (مترجم) غالب کے بتیس فارسی مکاتیب۔ مشمولہ تحقیق شمارہ ۶-۷(۱۹۹۷-۱۹۹۸):۲۷۹۔

۱۶- نامہ ہائے فارسی غالب:

۱۷- نقشِ آزاد:۲۷۹۔

۱۸- ذکر غالب:۶۸۔

۱۹- مآثر غالب:۲۳-۲۴۔

۲۰- مختار الدین احمد (مرتب) انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء)

اسلم پرویز

غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ: ایک تعارف

غالبؔ کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ۔ خلیق انجم نے ماہرینِ غالبؔ کی جس کہکشاں سے اپنی یہ کتاب منسوب کی ہے ان میں مولانا الطاف حسین حالیؔ، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، مالک رام، مولانا امتیاز علی عرشیؔ، مولانا غلام رسول مہر، شیخ اکرام اور پروفیسر نذیر احمد شامل ہیں۔ غالبؔ کے سلسلے میں خلیق انجم کی جو کاوشیں ہمارے سامنے ہیں ان میں 'غالب کی نادر تحریریں، غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ، پانچ جلدوں میں اردو خطوط غالبؔ کی تدوین اور اب ان کی تازہ کاوش، غالبؔ کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، شامل ہیں۔ خطوطِ غالبؔ کو شائع ہوئے اب کافی وقت ہو چکا ہے اور پانچ جلدوں پر مشتمل یہ کام اپنا ایک مقام بنا چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب بھی جیسا کہ اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک وقیع کام ہے۔ غالبؔ کے سلسلے میں کی جانے والی تحقیق کی یہ ایک نئی جہت ہے امید ہے یہ کتاب ایک ماہر غالبؔ کی حیثیت سے خلیق انجم کا گراف یقیناً کچھ اور اونچا کرے گی۔ خلیق انجم مجلسی زندگی میں جتنے غیر سنجیدہ، ہنسوڑ اور کبھی کبھی پھکڑّ بھی نظر آتے ہیں اپنی ادبی کارکردگیوں کے بارے میں وہ اتنے ہی سنجیدہ اور مستقل مزاج ہیں۔ بحیثیت

ادیب وہ خود کو کبھی بھی غیر مصروف نہیں رکھتے اس لیے ان کے ہاں تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔

کتاب کے شروع میں 'حرفِ آغاز' کے عنوان سے دس صفحات کی جو مختصر عبارت شامل ہے وہ بجائے خود کتاب کا اسی قدر جامع اور بھرپو مقدمہ بھی ہے۔اس 'حرفِ آغاز' کا ہر ہر لفظ قاری میں اس بات کا تجسس اور ولولہ پیدا کرتا ہے کہ اُسے اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے۔اس حرفِ آغاز کے مطالعے سے قاری کو یہ باور کرنے کا موقع بھی ملتا ہے کہ غالب کے سوانح سے متعلق جو تحقیقی کاوشیں اب تک ہوتی رہیں وہ اپنے آپ میں خواہ کتنی ہی بھرپور رہی ہوں لیکن اب اِس کتاب کے تناظر میں وہ قدرے نامکمل سی دکھائی دیتی ہیں۔اس اعتبار سے 'غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ' نام کی یہ کتاب غالب کے سوانح کا ایک انتہائی اہم باب ہے۔غالب کے موجودہ محققین بشمولِ خلیق انجم ہی اب یہ بات زیادہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر آیا سوانح غالب کا تکملہ ہو چکا ہے یا یہ کتاب احوالِ غالب کے سلسلے میں کچھ اور امکانات کی نشان دہی کرتی ہے۔کتاب میں بیان کردہ تحقیقی معلومات کی روشنی میں یہ بات تو بہر حال کہی ہی جاسکتی ہے کہ اس کتاب کے ذریعے غالب کی زندگی کے بہت سے مخفی گوشے روشن ہو کر سامنے آئے ہیں جن کی بنیاد پر پہلے کے بعض تحقیقی نتائج پر نظرِ ثانی کی ضرورت پیش آئے گی۔تاہم اس بیان کا مقصد خلیق انجم کو کسی اعلا تحقیقی منصب پر فائز کرنا نہیں بلکہ یہ باور کرانا ہے کہ غالب پر خلیق انجم کا موجودہ کام اس تحقیقی تعلق کے تابع ہے کہ تحقیق ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔کسی ایک ہی موضوع پر کوئی نئی تحقیق سے بشرطیکہ وہ معیاری اور سائنٹفک تحقیق ہو،اس کلیے کی توثیق ہوتی ہے۔لہٰذا اس کتاب کے بارے میں بھی،اس کی تمام تر خوبیوں کے باوجود یہ کہنا کہ اس کی تالیف کے ساتھ سوانح غالب کی مہم اپنی تکمیل کو پہنچ گئی ہے ایک غیر جدلیاتی رویہ ہوگا۔اصل بات یہ ہے اور یہی ایک بڑے محقق کا کارنامہ اور کنٹری بیوشن ہوتا ہے کہ احوالِ غالب کے سلسلے میں یہ کتاب کِن کِن نئے امکانات کی نشان دہی کرتی ہے۔یہ سوال اس کے بعد کا ہے کہ ان امکانات کو آگے چل کر خود خلیق انجم ہی بروے کار لاتے ہیں یا دوسرا کوئی محقق۔

ہمارے سنجیدہ اور معتبر لکھنے والوں نے کاروبارِ تنقید اور تحقیق کو ہمیشہ انشا پردازی

سے دور رکھنے کی صلاح دی ہے۔ انشا پردازی کس طرح تنقید کو مسمیر یزم اور تحقیق کو مضحک بنا کر رکھ دیتی ہے اردو میں اس کی سب سے دل کش اور اسی قدر عبرت ناک مثال محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' ہے۔ یہ آبِ حیات کو نیرنگ خیال سے آلودہ کرنے کی تمثال ہے۔ تحقیق کے میدان میں انشا پردازی کا سہارا وہی محقق لیتا ہے جو یا تو تحقیق کے معاملے میں بودا ہوتا ہے یا پھر وہ سرے سے تحقیق کا آدمی ہی نہیں ہوتا۔ اس عتبار سے، غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتہ کا ادبی معرکہ، ایک ٹھوس اور وزنی کام ہے۔ ساڑھے چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب کا تحقیقی متن تین چوتھائی صفحات پر محیط ہے بقیہ ایک چوتھائی یعنی سوا سو صفحات ضمیموں، حواشی، تعلیمات، اشاریوں اور کتابیات پر مشتمل ہیں۔ تحقیقی کھوج بین کرنے والوں کی فوری سہولت کے لیے اشاریوں کو تین مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے یہ عنوانات میں اشخاص، مقامات اور کتابیں اور رسالے۔ 'حرف آغاز' کے دس صفحات کو چھوڑ کر تحقیقی متن کے تین سو صفحات میں ایک سو دو مآخذ کی بنیاد پر جن معاملات اور مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے انہیں طول دے کر بہ آسانی کہیں سے کہیں پہنچایا جا سکتا تھا لیکن پھر شاید وہ تمام معلومات جو کتاب کے صفحات میں نگینوں کی طرح جڑی دکھائی دے رہی ہیں بسیار نویسی کے انبار میں راکھ کا ڈھیر ہو جاتیں تاہم جس قدر معلومات اس کتاب میں بہم پہنچائی گئی ہیں اس کی رو سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس کتاب کی بنیاد پر مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت علاحدہ علاحدہ کئی کتابوں کا خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے:

(ایک) غالب کی پنشن کا قضیہ' (دو) غالب کا سفرنامہ: دلّی سے کلکتہ تک' (تین) کلکتے کا ادبی معرکہ اور (چار) غالب اور ہندوستان کے فارسی شاعر اور فرہنگ نویس۔

(۱) غالب کی پنشن کا قضیہ: پنشن کا قضیہ غالب کے بلوغت کی عمر کو پہنچنے سے لے کر مرتے دم تک غالب کی جان کو چمٹا رہا۔ ایک انسان کی زندگی میں عام طور پر دو طرح کے غم ہوتے ہیں، غمِ عشق اور غمِ روزگار۔ خود غالب نے بھی یہی کہا ہے۔ لیکن غالب جیسے بڑے تخلیقی فن کار کے ہاں ایک سب سے بڑا کرب اور تھا اور جب غالب اس کرب میں مبتلا ہوتا تھا تو پھر وہ غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کی طرف سے غافل ہو کر اس کرب میں غلطاں اور

پیچاں دکھائی دیتا تھا۔ یہ کربِ آگہی کا تھا۔ زیرِ نظر کتاب سے پنشن کے قضیے کی جو تفاصیل سامنے آتی ہیں وہ اس درجہ اذیت ناک ہیں کہ ان کے رہتے ہوئے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان حالات میں بھی غالبؔ کی وہ حس کیوں کر برقرار اور بیدار رہیں جہاں ایک طرف وہ بنارس کی رومان پرور فضا میں اپنی تمام حِسّی سنسناہٹوں کے ساتھ خود کو تحلیل کر دیتا ہے اور دوسری طرف کربِ آگہی کے اسپ تازی پر سوار وہ کون و مکاں کی سرحدیں لانگتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اب یہ بات تو اِن حقائق کی روشنی میں جو اس کتاب کے ذریعے ہمارے سامنے ہیں نفسیاتی تنقید کا کوئی ماہر ہی بتا سکتا ہے کہ کہیں دنیاوی زندگی کی یہ پنشن زدہ اذیت ناکیاں ہی تو نہیں تھیں جنھوں نے ایک طرف اس کے رگ و پے میں حِسّی سنسناہٹوں کی جھنجھناہٹوں کے لطیف سنگیت کو برقرار رکھا اور دوسری طرف دانش وری کی سطح پر وہ دشت امکاں میں تمنّا کے دوسرے قدم کی تگ و دو میں غلطاں رہا۔ دیکھئے Sensousness اور کربِ آگہی کے ان دونوں رویوں کے نمونے پہلے 'چراغِ دیر' کے چند اشعار میں حنیف نقوی کے اردو ترجمے کی شکل میں جن میں غالب کی روح حلول کرتی دکھائی دیتی ہے:

زیارت گاہِ مستاں ہے یہ خطّہ | حریمِ بت پرستاں ہے یہ خطّہ
یہ گویا کعبۂ ہندوستاں ہے | عبادت خانۂ ناقوسیاں ہے
سراپا نورِ یزداں چشمِ بد دور | صنم اس کے مجسم شعلۂ طور
بحُسنِ سادگی مطلب کے دانا | بدن نازک مگر دل ہیں توانا
دہن مانندِ گُل شاداب و تازہ | تبسم کا لبِ رنگیں پہ غازہ
خرامِ ناز سے برپا ہو محشر | ادائیں صد گلستاں، جلوہ دربر
ستم میں خونِ عاشق کی جوانی | کرم میں موجِ گوہر کی روانی
سماں وہ زیرِ گل بنُ دام کا سا | وہ موزوں قد وہ عالم نقشِ پا کا
بہارِ بستر و نو روزِ آغوش | فروغِ حسن سے غارت گرِ ہوش
بتانِ بت پرست و برہمن سوز | جمالِ آتشیں سے انجمن سوز

اور اب کربِ آگہی کے یہ منظر ملاحظہ ہوں:

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

دیر و حرم آئینہ تکرارِ تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

دم بدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

بسانِ موج می بالم بہ طوفاں
بہ رنگِ شعلہ رقصم بہ آتش

بامن میاویز اے پدر فرزندِ آزر کا نگر
ہر کس کہ شد صاحبِ نظر، دینِ بزرگاں خوش نہ کرد

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اِک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے

(۲) غالبؔ کا سفرنامہ: دلّی سے کلکتہ تک: یہ سفرنامہ آج کے ترقی یافتہ زمانے کے ان

سفر ناموں سے یکسر مختلف ہوگا جہاں تیز رفتار اور آرام دہ سواریوں سے سفر طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچا جاتا ہے اور پھر جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس میں سفر کا بیان کم اور حضر کا زیادہ ہوتا ہے۔ غالب کا یہ سفر اور حضر ویسا بھی نہیں تھا جس کے بارے میں جنابِ خضر نے اقبال سے کہا تھا:

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ سفر بے برگ وساماں وہ حضر بے سنگ ومیل

یہ سفر نہ آہو کی بے پروا خرامی سے عبارت تھا اور نہ یہ بے برگ وساماں اور بے سنگ ومیل تھا۔ یہ اوبڑ کھابڑ راستوں سے طے ہونے والا تین ہزار کلومیٹر کا سفر تھا زندہ رہنے اور سفر کر سکنے کے تمام ساز وسامان کے ساتھ اور اس سفر کے برگ وساماں میں تنگیِ زر، خرابیِ صحت اور بہت سی دوسری صعوبتیں بھی شامل تھیں۔ یہ سفر کبھی گھوڑے پر، کبھی یکے پر، کبھی بیل گاڑی پر اور کبھی کشتی کے ذریعے طے ہوا تھا۔ غالب کی عمرِ عزیز کا چوہتروان حصہ اس سفر پر خرچ ہوگیا تھا یعنی ایک سال سے بھی کچھ زیادہ عرصہ۔ کانپور، لکھنؤ، الٰہ آباد، بنارس، باندہ اس سفر کے اہم سنگِ میل تھے اور کلکتہ اس کی منزل جہاں پہنچ کر ان کا حضران کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ایک ادبی معرکے کی صورت میں جنگ وجدل میں بدل گیا۔ گویا کلکتہ ان کے لیے واٹرلو، یا پانی پت کا میدان ثابت ہوا۔

غالب کا یہ انتہائی بھرپور سفرنامہ سیدھے سیدھے بیانیہ میں بھی لکھا جاسکتا ہے اور تخلیقی اور انشا پردازانہ انداز میں واحد متکلّمِ کی خود کلامی کی صورت میں بھی تیار کیا جا سکتا ہے۔ غرض الگ الگ طرح کے کلاکار اس مواد کی بنیاد پر جو یہاں جمع ہے اس سفرنامے کے ساتھ اپنے اپنے فن کا جادو جگا سکتے ہیں۔ بنارس کے منظر کو علاحدہ ایک اوپیرا کی شکل بھی دی جاسکتی ہے۔

(۳) کلکتے کا ادبی معرکہ: تاریخ ادب میں جو ادبی معرکے ہوتے رہے ہیں اور خود غالب کی زندگی میں بھی اس کے علاوہ جو دو اور ادبی معرکے ایک ذوق کے ساتھ جواں بخت کے سہرے کو لے کر اور دوسرا برہان قاطع کا ان سب کی نوعیت محض ادبی معرکوں کی تھی۔ کلکتے کا ادبی معرکہ تو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت غالب پر تھوپا گیا تھا۔ دراصل غالب اور

مرزا افضل بیگ کے درمیان پنشن کے حقوق کو لے کر ایک سرد جنگ پہلے سے چلی آ رہی تھی۔

کلکتے میں غالبؔ ایک غریب الوطن کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے جب کہ مرزا افضل بیگ وہاں پہلے ہی سے مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے وکیل کی حیثیت سے موجود تھے اور یہاں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھی اپنا اثر رسوخ بڑھا چکے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے حامیوں اور طفیلیوں کا ایک ٹولہ بھی تھا اور انہیں یہ بھی خبر تھی کہ غالبؔ اپنی پنشن کے مقدمے کو لے کر کلکتے پہنچنے والے ہیں۔ چناں چہ غالبؔ کو ہر طرح پسپا کرنے کی تیاریاں یہاں پہلے ہی سے شروع ہو گئی تھیں۔ یہ بات سب جانتے تھے کہ غالبؔ، قتیلؔ کی فارسی دانی کے کبھی قائل نہیں رہے اس لیے حامیانِ قتیلؔ کو بھی مرزا افضل بیگ نے اپنے ساتھ ملا لیا اور غالبؔ کو کلکتہ میں ادبی معرکہ آرائی میں الجھا لیا گیا۔ یوں غالبؔ کی جان کو ایک چھوڑ دو دو مقدمے لگ گئے ایک پنشن کا اور دوسرا ادبی معرکے کا۔ ان دونوں کی بھرپور تفصیل کتاب میں موجود ہے۔ جنگ کی حکمتِ عملی میں اسے دو طرفہ حملہ کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے کلکتے کے ادبی معرکے کی ادبی کے ساتھ ایک ڈرامائی حیثیت بھی ہے۔

(۴) **غالب اور ہندوستان کے فارسی شاعر اور فرہنگ نویس:** یہ موضوع غالبؔ کے سفر کلکتہ یا کلکتے کے ادبی معرکے سے براہِ راست تو کوئی تعلق نہیں رکھتا لیکن چوں کہ کلکتے کے ادبی معرکے میں حامیانِ قتیلؔ بھی غالبؔ کے مخالفین کی صف میں تھے اس لیے قتیلؔ اور حامیان قتیلؔ کے سلسلے میں بھی غالبؔ نے وہی رویہ اختیار کیا جو ان کا ہندوستان کے فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کی جانب تھا۔ غالبؔ کو اپنی فارسی دانی پر بڑا ناز تھا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اردو کلام کو بھی اپنے فارسی کلام کے مقابلے میں 'مجموعۂ بے رنگ' قرار دے دیا تھا۔ تاہم جب ہم غالبؔ کے ساتھ ہندوستان کے فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کا تذکرہ کریں گے تو ہمیں اس کتاب کے دائرے سے باہر نکل کر ان فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کو بھی بحث کا موضوع بنانا پڑے گا جو کلکتے کے ادبی معرکے سے باہر تھے لیکن جن کا ذکر کسی نہ کسی طور اس کتاب میں موجود ہے۔ ایسے لوگوں میں قتیلؔ کے علاوہ مولوی غیاث الدین عزت رام پوری مولف 'غیاث اللغات' اور

غرائب اللغات کے مولف عبد الواسع ہانسوی شامل ہیں۔

ہندوستان کے فارسی دانوں میں غالب صرف خسرو اور بیدل کو مانتے تھے۔ ان کے علاوہ اپنے مربیوں میں انہوں نے مرزا ہرگوپال تفتہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، انوار الدولہ سعاد الدین خاں شفق، ولایت علی خاں ولایت عزیز صفی پوری، نواب کلبِ علی خاں، مفتی صدر الدین آزردہ، اور ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی فارسی دانی کو بھی سراہا ہے۔ بہر حال چوں کہ یہ معاملہ کتاب کے موضوع سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتا لیکن اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور اس کا ایک سرا میانِ قتیل سے بھی ملتا ہے اس لیے کتاب میں اس کی موجودگی کا جواز تو ہے لیکن پھر بھی شاید بہتر یہی ہوتا کہ اسے براہِ راست کتاب کے متن میں شامل کرنے کے بجائے ضمیموں کا حصہ بنا دیا جاتا۔

بہر حال اس کتاب کی تکمیل میں مصنف کی کوشش و کاوش اور تحقیقی مہارت کو جتنا دخل ہے وہ اپنی جگہ لیکن جس چیز نے اس کام کو معیار اور اعتبار عطا کیا ہے وہ ہے غالبیات کے موضوع کے ساتھ خلیق انجم کی چالیس سالہ وابستگی۔ اس کے علاوہ اس میں بہت کچھ دخل اس مشق و ممارست کا بھی ہے جو غالب کے اردو خطوط کی تدوین کے وسیلے سے بھی حاصل ہوئی۔ آج یہ کہنے میں شاید کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ تحقیق کی حد تک خلیق انجم بھی غالب شناسوں کی برادری کے ایک فرد ہیں۔ تخلیقی سطح پر تفہیمِ غالب ایک جدا میدان ہے لیکن نقدِ غالب کی صحیح سمت کے تعین میں سب سے بڑی ضرورت غالب سے متعلق مستند تحقیقی مواد کی فراہمی اور متنی تنقید کے اصولوں کے مطابق غالب کے نثری اور شعری متنوں کی تدوین کا ہے۔

تحقیق اور تنقید میں سے برتری کس کو حاصل ہے یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن اولیت کا سہرا تو بہر حال تحقیق ہی کے سر ہے۔

تحقیق بظاہر ایک خشک مضمون ہے۔ تحقیقی کتابوں کے مطالعے کی ضرورت زیادہ تر مصیبت کے ماروں ہی کو ہوتی ہے۔ بہر حال تحقیق میں بھی انشا پردازی کی بدعت سے بچتے ہوئے ایک خوش گوار اسلوب تو اختیار کیا ہی جا سکتا ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مشفق خواجہ اور رشید حسن خاں جیسے محققین کی اکثر تحریریں اس کی روشن مثالیں ہیں۔ غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، نام کی یہ کتاب غالب کی زندگی سے متعلق قدم

قدم پر ایسی نئی نئی معلومات لے کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ اس کے مطالعے میں شروع سے آخر تک ایک جاسوسی ناول کی سی دل چسپی برقرار رہتی ہے۔ اس میں غالبؔ کے طفیل اور خلیق انجم کی توفیق دونوں ہی کا حصّہ ہے۔

ابوذر ہاشمی

غالب اور اہل بنگالہ

لسانی اور نظریاتی آویزش کے پس منظر میں

غالبؔ اور اہل بنگالہ لسانی اور نظریاتی آویزش کے سلسلے سے جڑے ہیں۔ اگر چہ اس سلسلے کی بعض کڑیاں بالواسطہ ہیں، لیکن شعر و ادب کے مقام و معیار اور روایت کی تفہیم و تعین میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

غالبؔ کلکتے آئے تو ملوکیت کی عصبیت بھی ساتھ لائے۔ اس ترک بچے نے تیغِ جوہر دار کو قلم بنایا۔ وہ تیغ جس نے ہندوستانیوں کو مغلوب کر کے نہ صرف سیاست و ملوکیت کو مطیع کر لیا تھا، بلکہ قلم بن کر تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کو بھی اپنے رنگ میں ڈھال لیا۔ چنانچہ مغلوں کے ساتھ ان کی زبان فارسی بھی نہ صرف عدالت پر قابض ہوئی بلکہ شعر و حکمت کے اظہار کا ذریعہ بھی بن گئی۔ اس طرح سرزمینِ ہند میں بھی فارسی زبان و ادب کے نابغۂ روزگار پیدا ہوتے رہے۔ تاہم فارسی زبان و ادب کی گراں بہا خدمات کے باوجود ان کی شناخت اور پذیرائی ملوکیت کی عصبیت کا شکار رہی۔

زبان و ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ کسی مخصوص خطۂ ارض کے باشندے، زبان کی

ابتداًاور ارتقاء میں زمانی تفوق کی بنا پر خود کو اہلِ زبان تصور کرتے ہیں اور اس زبان کے دوسرے خطۂ ارض کے لوگوں کو کمتر جانتے ہیں۔ چنانچہ عربوں نے عربی زبان کے تعلق سے خود کو اہلِ زبان تصور کیا۔ لیکن جب عربی حکومت اور زبان وادب دوسرے خطۂ ارض میں پھیلا، تو وہاں کے عربی دانوں کو عجمی یعنی گونگا کے لقب سے نوازا۔ ایرانیوں نے بھی فارسی کے تعلق سے خود کو اہلِ زبان مانا اور ہند کے فارسی دانوں کو کمتر جانا۔ لیکن ہند کے فارسی داں بھی اپنی لسانی اور ادبی شناخت کے آرزومند رہے۔ اہلِ زبان کی نخوت وعصبیت اور دیگر خطۂ ارض کے فنکاروں کی لسانی اور ادبی شناخت کی آرزومندی نے ادبی آویزشوں کو جنم دیا۔ چنانچہ عرفی فیضی کو اس کی تمام تر علمی فضیلت اور ادبی لیاقت کے باوجود خاطر میں نہیں لاتے۔ غالبؔ بھی اگرچہ ہندوستان میں پیدا ہوئے، تاہم ان کے اجداد کے ترکِ وطن کا زمانی بعد چونکہ مختصر تھا اس لیے وہ خود کو ترک اور پارسی دانی میں اہلِ زبان کے ہم پلہ تصور کرتے تھے۔ وہ ہندوستان میں خسرو اور بیدل کے علاوہ کسی اور کو وہ فارسی داں نہیں مانتے تھے۔ شاید اس لیے کہ یہ دونوں بھی ترک بچے تھے۔ غالبؔ فیضی کے تعلق سے بھی یہ کہتے تھے کہ میاں فیضی کی بھی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ غالبؔ ملوکیت کی اس عصبیت کے ساتھ کلکتے آئے۔ کلکتہ اس وقت ہندوستان کے پوربی علاقے کا ایک نو آباد صنعتی اور تجارتی شہر تھا۔ ادبی، ثقافتی اور تہذیبی روایت سے تہی اور ایک مزدور پیشہ سماج یا پھر انگریز سامراجیت کا مظہر۔ ہاں یہ ضرور تھا، کہ کلکتے اور اس کے قرب وجوار میں اس وقت بھی آٹے میں نمک کے برابر کچھ ذی علم اور باادب حضرات مختلف وسیلوں اور حوالوں سے موجود تھے۔ تاہم ریختہ کے اہلِ زبان یعنی اہالیانِ دہلی اور لکھنؤ میں یہ ضرب المثل تھا کہ پوربی لوگ ریختہ کیا جانیں۔ ایسے میں غالبؔ اہلِ بنگالہ کی ریختہ گوئی یا فارسی دانی کی قدر کیا کرتے۔ وہ تو جب کلکتے سے لوٹے تو اہلِ بنگالہ کی ریختہ گوئی کا یہ نمونہ احباب کی ''ضیافتِ طبع'' کی خاطر لے گئے وہ یہ شعر تھا۔

تم کہو گے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
بندہ پرور رات بھر اس غم میں ہم کھائے نہیں

ڈیڑھ دو برس کے قیام کلکتہ کے بعد اس شعر کا انتخاب بنگال کے شعری معیار کے

متعلق غالبؔ کی رائے بلکہ عصبیت کا بین مظہر ہے۔ دوسری جانب اہلِ بنگالہ بھی اپنی لسانی ودابی شناخت کی آرزومندی کے اسیر تھے۔ اس طرح غالبؔ کی عصبیت اور اہلِ بنگالہ کی آرزومندی، لسانی آویزش میں ڈھل گئی اور افضل بیگ اس آویزش کے اظہار کا بہانہ بن گیا۔

غالبیات سے شغف رکھنے والے سبھی لوگ جانتے ہیں کہ غالبؔ کی کلکتہ آمد پر افضل بیگ کی ریشہ دوانی کی بنا پر مدرسہ عالیہ کے مشاعروں میں غالب کی لفظیات پر اعتراضات ہوئے، اور اس عمل میں شاگردانِ قتیلؔ پیش پیش رہے، کہ غالب قتیلؔ کو کھتری بچہ تصور کرتے تھے۔ فی الوقت اس قضیے کی تفصیل کی ضرورت نہیں، کہ غالبؔ کی کلکتہ آمد پر ادبی معرکہ آرائی اور عالم بجائے 'ہمہ عالم، بیش بجائے بیش تر برخواستن بہ معنی روئیدن اور زدہ وغیرہ کے استعمال کے قضیے پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے' اور اکثر لوگ اس کی تفصیل سے واقف ہیں۔ البتہ اس لسانی آویزش یا غالبؔ کے قیام کلکتہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے عقدۂ مالاینحل کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ تاہم اس قضیے کی خیزش سے قبل غالبؔ اور اہلِ بنگالہ کی لسانی آویزش کے سلسلے کی دوسری کڑیوں کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی قاطعِ برہان سے متعلق مباحثہ ہے۔ غالبؔ کی قاطعِ برہان کی اشاعت (۱۸۶۱ء) کے بعد دنیائے ادب میں زبردست بھونچال آیا۔ محرق قاطع، ساطعِ برہان، قاطع القاطع وغیرہ جوابی کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن اس پر تمام محققین وناقدین ادب متفق ہیں کہ اس سلسلے کی سب سے اہم، مدلل اور وقیع کتاب مؤید برہان ہے جس کے مولف آغا احمد علی جہانگیر نگری ہیں۔ مؤید برہان کے جواب میں غالبؔ نے تیغ تیز لکھی اور اس کے جواب الجواب کے طور پر پھر مولوی احمد علی نے شمشیر تیز تر لکھ ڈالی۔ اس کے علاوہ خود غالبؔ کے قوافی، ردیف اور وزن میں قطعات نگاری کا سلسلہ بھی حامیانِ غالبؔ اور مخالفین غالبؔ کے درمیان جاری رہا، جو ہنگامۂ دل آشوب کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ غالبؔ اور اہلِ بنگالہ کے درمیان لسانی آویزش کے سلسلے کی یہ دوسری کڑی تھی جو کئی برسوں پر محیط رہی۔ مالک رام مؤید برہان کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"یہ (مؤید برہان) اس سلسلے کی سب سے مضبوط اور وقیع

کتاب ہے جو مطبع مظہر العجائب، کلکتہ میں ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۶ء میں چھپی تھی۔" (ذکرِ غالب، ص ۸۷)

مؤیدِ برہان کی علمی قدر و قیمت سے الگ مولوی احمد علی کو اس منصفی کی داد ابھی ملنی چاہیے کہ باوجود اس کے کہ غالب نے احمد علی کو سخت و سست کہا تھا، انہوں نے اپنی کتاب ہفت آسماں میں نہ صرف غالب کا ترجمہ پیش کیا بلکہ غالب شناسی کا حق بھی ادا کیا۔

اس واقعے کے کم و بیش بیس برسوں کے بعد اہلِ بنگالہ کی لسانی شناخت کی آرزو مندی ایک بار پھر معرکہ آرائی پر منتج ہوئی[۲]۔ اگر چہ اس معرکہ آرائی کا تعلق براہ راست غالب سے نہ تھا، لیکن قاطعِ برہان کی معرکہ آرائی کے تفاعل نے نساخ کو روشنی دکھائی تھی، اور نساخ نے لکھنؤ کے شعرائے نام آور مثلاً انیس، دبیر، وزیر وغیرہ کے کلام کی غلطیاں نکالیں۔ انہوں نے اپنے دو دیوان دہلوی رنگ میں اور دو دیوان لکھنوی رنگ میں بھی پیش کیے تا کہ سند رہے کہ بنگالی شاعر دہلوی رنگِ سخن پر قدرت رکھتا ہے تو لکھنوی رنگِ سخن بھی اس کے سامنے گرد ہے۔ نساخ کی یہ معرکہ آرائی نہ صرف مزاجاً غالب اور اہلِ بنگالہ کی معرکہ آرائی سے قریب تھی، بلکہ اسی معرکے کے تفاعل سے گراں بار تھی کہ اہلِ بنگالہ دبستانِ دہلی کے ایک نابغۂ روزگار سے معرکہ کر چکے تھے اور اب دبستانِ لکھنؤ کے زعمائے ادب کی باری تھی۔ اس لیے ہمیں اصرار ہے کہ اسے بھی غالب کے قیامِ کلکتہ کا بالواسطہ حاصل تصور کیا جانا چاہیے۔

اس سلسلے کی چوتھی اور آخری کڑی، معرکہ آرائی کی بجائے تتبع غالب سے جڑی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب پیرویِ غالب کے رجحان نے وبا کی صورت اختیار کر لی اور غالب پرستی ایک فیشن بن گئی تو بنگالی شاعر نے اس میں بھی مسابقت کی کوشش کی۔ ہمارا اشارہ وحشت کے تتبع غالب کی طرف ہے۔ اس مقام پر ضمناً یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ بنگال کے مداحان غالب میں وحشت کا نام تتبع کی بنا پر نمایاں رہا۔ لیکن خود قتیل کے شاگرد قاضی محمد صادق اختر تذکرۂ آفتابِ عالم تاب میں جس طرح غالب کی توصیف میں رطب اللسان ہوئے، وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے علاوہ مولانا آزاد بھی غالب کی ستائش میں دفتر سیاہ کرتے رہے۔ سید لطیف الرحمٰن کی کتابیں

اور مولانا معصومی کی بعض وقیع تحریروں کے علاوہ اور بہت سے دوسرے اہلِ علم نے بھی قرضِ غالب ادا کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ مختصر یہ کہ اہلِ بنگالہ نے غالبؔ کو اپنی لسانی شناخت کی آرزومندی کے سبب اگر ایک طرف ہدف بنایا تو دوسری جانب ان کی قدر شناسی میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ البتہ ان لسانی اور ادبی آویزشوں کے جلو میں جو عقدۂ مالا ینحل سامنے آیا، وہ غالب کے قیامِ کلکتہ کے اثرات سے جڑا ہے۔

بعض قلم کاروں نے جا بجا اور بالخصوص احتشام حسین نے ''غالبؔ کا تفکر'' میں سفر کلکتہ کو ان کا ذہنی اور فکری موڑ قرار دیا ہے۔ وہ بنگالے کی طبقاتی کشمکش، سماجی پس منظر اور انگریزوں کی لائی ہوئی مشینی اور سائنسی برکتوں کے مشاہدے کو غالبؔ کی بصیرت افروزی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔[۳]

دراصل ہماری تنقید کے مختلف مکاتب فکر نے غالبؔ کو اپنے نظریے کے چوکھٹے میں فریم کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ احتشام حسین نے بھی اپنی نظر کے بجائے نکتۂ نظر کے اسیر ہو کر غالبؔ کو مادی جدلیات کا شاعر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ احتشام حسین کی تحریر وقیع اور استدلال فلسفیانہ مگر نظریاتی ہوا کرتی ہے۔ پیرایۂ بیان کی دلکشی کفر پر بھی ایمان لانے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ احتشام حسین نے غالبؔ کو ترقی پسند بنانے کے لیے ایک پس منظر فراہم کرنا ضروری خیال کیا اور اس کا رشتہ بنگال کی طبقاتی کشمکش سے جوڑنے کے لیے قیامِ کلکتہ کا سہارا لیا۔ بنگال کی طبقاتی کشمکش سے غالبؔ کی اثر پذیری کے ثبوت کے لیے احتشام حسین آئینِ اکبری کی تقریظ پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ احتشام حسین نے غالب کو طبقاتی کشمکش اور مادی جدلیات سے جوڑنے کے لیے سفر کلکتہ (اور غدر وغیرہ) کو بنیاد تو بنایا لیکن جو اشعار پیش کیے وہ سفر کلکتہ سے بہت پہلے کہے گئے اشعار ہیں۔ دو اشعار دیکھیے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
(۱۸۱۶ء)

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
(۱۸۲۶ء)

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
(۱۸۲۶ء)

سفر کلکتہ سے تقریباً بارہ برس قبل کہے گئے پہلے یا اس جیسے دوسرے اشعار کا حوالہ شاید کہ اس لیے کافی نہ تھا کہ قیامِ کلکتہ کے نتیجے میں نئے طبقاتی شعور اور سائنسی ترقی کے مشاہدے کے بغیر غالب کو مادی جمالیات کا شاہد قرار دیا جا سکتا تھا، نہ ہی ایک نظریاتی بنیاد فراہم کی جا سکتی تھی۔

حالانکہ حقیقی صورت حال یہ تھی کہ غالبؔ بنگال آنے کے باوجود اس طبقاتی کشمکش سے اگر بے خبر نہ بھی تھے تو بے اثر ضرور تھے اور انگریز گورنر جنرل کے دربار ''دس لمبر'' کی کرسی پا کر مطمئن اور خوش تھے۔ وہ اپنی شعری صلاحیت سے زیادہ اپنی خاندانی ریاست اور فخامت پر نازاں تھے۔ ایسے میں احتشام حسین کا تفکر یا غالبؔ کو طبقاتی کشمکش سے جوڑنے کی کوشش نظریے کی پاسداری محض ہو کر سامنے آتی ہے۔ تاہم احتشام حسین کے اس محاکمے کے بعد عام طور پر یہ تاثر قائم ہو گیا کہ سفرِ کلکتہ، غالبؔ کی نظم و نثر اور اسلوب و فکر کی تبدیلی کا سبب بنا۔ قلمکاروں نے اس خیال کو تقلیدی طور پر قبول کیا اور نقل در نقل کا ایک سلسلہ سا چل پڑا۔ اہلِ بنگالہ نے بھی اسے اپنے لیے ایک کلغی تصور کیا۔ فورٹ ولیم کے بعض منشیوں سے غالبؔ کی ملاقات، سادگیِ زبان کی انگریزوں کی تحریک، جدید ایجادات کا مشاہدہ اور خطوطِ غالبؔ میں انگریزی کے الفاظ کے بے تکلف استعمال کو اس تبدیلی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔

غالبؔ کی شاعری کے مطالعے سے یہ راز کھلتا ہے کہ ان کے فکر و اسلوب پر قیامِ کلکتہ کا قابلِ لحاظ اثر نہیں۔ یوں تو شیخ محمد اکرام اور بعض دوسرے ماہرینِ غالبؔ نے بھی کلامِ غالبؔ کے ادوار متعین کر دیئے تھے لیکن کچھ عرصہ قبل کالی داس گپتا رضا نے غالبؔ کے

تذکروں، غیرہ متداول بیاضوں اور دیگر شواہد کی بنیاد پر ''دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے'' مرتب کر دیا ہے۔ اس طرح انہوں نے غالب شناسی کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔ اب اگر غالب کی شاعری پر قیامِ کلکتہ کے کچھ واضح اثرات ہیں تو اسے ۱۸۲۹ء کے بعد کی شاعری میں نمایاں ہونا چاہیے کہ غالب کی کلکتے سے واپسی ۱۸۲۹ء کے اواخر تک ہو چکی تھی۔ غالب کے اردو کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۶ء تک زیادہ تر فارسی زبان میں شاعری کرتے رہے۔ ان سولہ سترہ برسوں میں متداول اور غیر متداول اشعارِ اردو کی کل تعداد صرف نناوے ہے، جن میں غزل کے چھہتر اشعار ہیں۔ اس عرصے میں فارسی پر زیادہ توجہ کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ کلکتے میں گرچہ غالب کی زباں دانی پر جا و بے جا اعتراضات ہوئے، لیکن دلّی سے دور غالب کو فارسی کا چلن نظر آیا اور ان کو کچھ فارسی داں بلکہ قدرداں بھی ملے، تو انہوں نے اس سے بہتر تاثر قبول کیا۔ رشکِ فارسی تو وہ تھے ہی، کلکتے کے ادبی ہنگامے نے فارسی گوئی کو اور بھی مہمیز لگایا۔ اس طرح کلامِ غالب پر قیامِ کلکتہ کا یہ بنیادی اثر تصور کیا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری پر قیامِ کلکتہ کے اثرات کی تلاش میں نگاہ ان اشعار پر ٹھہرتی ہے، جن میں وطن سے دور رہنے کا ذکر ہے، یا پھر کلکتہ سے ناکام واپسی کے سبب حزن و ملال کا اظہار۔ مثلاً:

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم
(۱۸۳۳ء)

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی
(۱۸۳۳ء)

دکھ، جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل، رک رک بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں!
سونا، سوگند ہو گیا ہے، غالب
(۱۸۳۳ء)

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
(۱۸۳۳ء)

حزن وملال کو پیش کرنے والے اشعار کے علاوہ معاملہ بندی پر مشتمل بعض اشعار کو بھی اولین نظر میں قیامِ کلکتہ کا اثر تصور کیا جا سکتا ہے، کہ کلکتہ میں نازنین بتانِ خود آرا نے وہ تیر مارا تھا اور صبر آزما نگاہوں نے کچھ اس طرح اشارے کیے تھے کہ وہ تا عمر ہائے ہائے کرتے رہے۔ ملاحظہ ہو:

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
(۱۸۳۳ء)

نظر لگے نہ کہیں اس کے دستِ بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
(۱۸۳۳ء)

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیدار میں آوے
(۱۸۳۳ء)

دل سے تری نگاہ، جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
(۱۸۳۳ء)

اور آخر میں قیامِ کلکتہ کی یاد میں زبان زدِ خاص وعام یہ قطعہ بند اشعار بھی پیش ہیں جو ۱۸۳۳ء کے آس پاس لکھے گئے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرہ کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

لیکن بنیادی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالب کے یہاں معاملہ بندی کا یہ رجحان کلکتے کی نازنیں بتانِ خود آرا، اور ان کے کھلے دست و بازو دیکھ کر ہی پیدا ہوا، یا اس سے قبل بھی ان کے یہاں یہ رجحان موجود تھا۔ کلامِ غالب کی تاریخی ترتیب کے مطالعے سے یہ بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، کہ غالب کے یہاں معاملہ بندی کا یہ رجحان قیامِ کلکتہ کی عطا نہیں۔ مثال کے لیے صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لے تو لوں سوتے میں اس کے پانوں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ ظالم بدگماں ہو جائے گا
(۱۸۱۶ء)

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا، کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا، کہ یوں!
(۱۸۱۶ء)

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کے عذرِ مستی ایک دن
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن
(۱۸۲۱ء)

مختصر یہ کہ معاملہ بندی پر مشتمل وہ اشعار بھی جن پر قیامِ کلکتہ کے اثر کا گمان ہو سکتا ہے، کسی فکری رجحان کی تبدیلی کا پتہ نہیں دیتے۔ دوسرے یہ کہ معاملہ بندی پر مشتمل اشعار غالب کی عظمت کی اصل شناخت بھی نہیں۔ غالب کی عظمت اور آفاقیت تو دراصل حکمت و معرفت سے مملو اشعار میں مضمر ہے۔ اس ضمن میں قیامِ کلکتہ کے بعد کی ایک غزل کا یہ مشہور

شعر ملاحظہ ہو:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے کہ بس اب لذتِ خواب سحر گئی
(۱۸۳۳ء)

کہا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت، نئی ایجادات اور سیاست وحکومت پر کنٹرول کے انگریزوں کے جدید انتظامات نے، غالبؔ کو مغلیہ حکومت کے اختتام کا احساس، قیامِ کلکتہ کے دوران ہی دلا دیا تھا۔ اس لیے غالبؔ نے اس زوال کو لذتِ خوابِ سحر کے جانے سے تعبیر کیا۔ لیکن ذرا توقف کیجیے! کہ غالبؔ قطرے میں دجلہ دیکھنے کے دعوے دار ہیں، تو کیا انکا دیدۂ بینا مغل حکومت کے زوال کے آثار کو کلکتے میں انگریزوں کا کروفر دیکھے بغیر محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ شاید نہیں، بلکہ یقیناً ایسا نہیں تھا۔ قیامِ کلکتہ کو غالبؔ کی بصیرت افروزی کا ذریعہ قرار دینا کم نگہی ہے یا پھر غالب کے دیدۂ بینا کا انکار۔ وہ دیدۂ بینا جو کلکتہ آنے سے قبل یہ مشاہدہ کر چکا تھا کہ:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

کیا یہ ظفر کی حکومت کی خموشی و بے بسی کا اشاریہ نہیں۔

اس مختصر تجزیے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ قیامِ کلکتہ، غالبؔ کی فکرونظر یا اسلوب وانداز میں کسی بنیادی اور نمایاں تبدیلی کا سبب نہیں بنا۔ اب رہی بات آئینِ اکبری کی تقریظ میں جدید دور کی برکتوں کے ذکر کی، تو ان کی حیثیت بقول غالب ''ہوتا ہے شب وروز تماشا مرے آگے'' کی ہے۔ آئین اکبری کی تقریظ اس طور پر تو اہم ہے کہ اس میں بعض نئی مادی اشیاء یا ایجادات کا ذکر در آیا۔ تاہم اسے غالب کے اندرون کی اپج اور تخلیقی بصیرت کا ابال قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو ایسے حقائق کا منظوم بیان ہے، جس پر صرف غالب کی نہیں بلکہ اس دور کے دیگر باشعور افراد واشخاص کی نظر تھی بلکہ خود سرسید کی بھی۔ اس منظوم بیان کو تخلیقی شاعری کے زمرے میں مشکل سے رکھا جا سکتا ہے۔ (اور بجا طور احتشام حسین نے بھی اسے تخلیقی اشعار کی بجائے منظوم بیان ہی تسلیم کیا

ہے)۔ شب و روز کے تماشوں کا مجرد بیان خلاق شاعر کا شیوہ نہیں۔ تخلیق کے عمل میں ان کی حیثیت تماشوں کی ہے۔ خلاق شاعر کے لیے ایسے تماشے بس اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ اجتماعی لاشعور میں خوابیدہ تجربوں کو مماثلت یا عدم مماثلت کی بنا پر بیدار کر دیں۔

بات نفسیات کی در آئی ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص ڈیڑھ دو سال تک ایک مقام پر رہے، وہاں مجاد لے کرے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے اثرات قبول نہ کرے۔ اس لیے قطعیت کے ساتھ یہ کہنا کہ غالب نے قیامِ کلکتہ کے دوران یہاں کے کچھ اثرات قبول نہیں کیے یا شاعری میں اس کا اظہار نہیں ہوا مناسب نہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غالب غزل کا شاعر تھا اور غزل اور ایمائیت اور رمزیت کے اوصاف کی حامل ہوا کرتی ہے۔ اس لیے ان اثرات کا اظہار بھی اشارے و کنائے میں ہوگا، نیز رمز و اشارت کا یہ اظہار کسی محدود و مخصوص وقت کا تابع بھی نہیں ہو سکتا۔ جب کہ زیرِ نظر تحریر میں قیامِ کلکتہ کے اثرات کی تلاش کے لیے ۱۸۴۶ء تک کے اشعار پر ہی توجہ دی گئی۔ اس طرح کی مزید تاویلات پیش کی جا سکتی ہیں اور ۱۸۴۷ء یا اس کے بعد کے کلام سے حکیمانہ اور عارفانہ اشعار پیش کر کے کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی فکری رسائی ان تک اس لیے ہو سکی کہ انہوں نے کلکتے میں ایک جدید دور کا آغاز دیکھا اور وہاں سے انہیں نئی بصیرت ملی۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے جو قیام کلکتہ کے بعد کہے گئے ہیں اور نئے شعور کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
(۱۸۴۷ء)

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
(۱۸۴۷ء)

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ کس حساب میں
(۱۸۴۷ء)

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
(۱۸۴۷ء)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
(۱۸۴۷ء)

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
(۱۸۵۳ء)

مختصر یہ کہ ایسے بہت سے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جو بادی النظر میں اس مفروضے کی تائید کرتے نظر آئیں گے کہ کلکتے سے واپسی کے بعد غالب نے زیادہ حکیمانہ و عارفانہ شاعری کی۔ لیکن یہ دراصل گزشتہ کئی دہائیوں میں بیٹھائے گئے اس مفروضے کی عاجلانہ تاویل ہوگی کہ غالب نے کلکتے میں طبقاتی کشمکش اور نئی ایجادات کا مشاہدہ کیا، جس نے ان کے شعور کو نئی جہت بخشی۔ حق تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا اشعار یا اس جیسے اشعار قیامِ کلکتہ سے قبل تخلیق کردہ اشعار کا ہی پرتو ہیں۔ غالب ابتدا سے ہی حکیمانہ اور عارفانہ نکتے کی تلاش میں رہے۔ اسی تلاش نے ان کو بیدل کی طرف مائل کیا تھا۔ غالب کا تخلیقی سوتہ انگریزوں کے کلکتے کا رہین نہ تھا۔ یہ تو مغلوں کے سیاسی کمال اور ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب کے جمال کا پروردہ تھا۔ اس لیے اکثر باشعور نقادوں نے غالب کو ہند مغل تہذیبی جمالیات کے نقیب سے تعبیر کیا ہے۔ وہ جمالیات جو اپنی اصل میں مشرق کی شناخت ہے، اور ادبی قدر میں ڈھل کر آج بھی اہلِ مغرب کے لیے طلسم خانۂ حیرت ہے۔ وہ مشرقی جمالیات جب فارسی قالب میں ڈھلی تو فردوسی، رومی، سعدی، حافظ وغیرہ کے نام کے حوالے سے پہچانی گئی، اور جب اردو قالب میں ڈھلی تو میر و غالب اور اقبال کے نام سے جانی گئی۔ اس لیے یہ کہنا کہ مذکورہ بالا اشعار قیامِ کلکتہ کے دوران نئے شعور کی یافت کے مشکورِ منت ہیں، بجا نہیں۔ یہ اشعار تو اسی تخلیقی آگہی کا پرتو ہیں، جس کا اظہار غالب پہلے بھی کر چکے ہیں۔ فی الوقت قیامِ کلکتہ سے قبل کے صرف چند اشعار ملاحظہ کیجیے اور ان میں اس ذہن کی کارفرمائی دیکھیے جو ۱۸۴۷ء یا اس کے

بعد کہے گئے اشعار میں بھی موجزن ہے۔ یعنی ذہن وفکر تو بنیادی طور پر وہی ہے، لیکن زمانے کا فرق ضرور ہے۔

گدائے طاقتِ گفتار ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

۱۸۱۶ء غیر متداول

جو کچھ ہے محوِ شوخیِ ابروئے یار ہے
آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی

(۱۸۲۱ء)

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

(۱۸۲۱ء)

ہر چند ہر اک شئے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شئے نہیں ہے

(۱۸۲۱ء)

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

۱۸۲۶ء

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنگ ظرفیِ منصور نہیں

بعد از ۱۸۲۶ء

اور چند اشعار یہ بھی نظر میں رہیں:

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

۱۸۱۶ء

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پایا

۱۸۲۱ء

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

۱۸۲۱ء

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

۱۸۲۱ء

الغرض ۱۸۴۷ء کے بعد کلامِ غالبؔ سے جتنی مثالیں قیامِ کلکتہ کے اثرات کے نتیجے میں پیش کی جاسکتی ہیں، ان سے کہیں زیادہ مثالیں ان ہی موضوعات اور احساسات کا احاطہ کرتے ہوئے سفر کلکتہ سے قبل کی شاعری سے لائی جاسکتی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالبؔ کی شاعری پر قیامِ کلکتہ کے قابلِ لحاظ اثرات نہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک کلکتہ تہذیبی روایت کا ایسا مرکز نہیں بن سکا تھا جس سے غالبؔ اخذ و جذب کرتے۔ اس لیے جب وہ کلکتے سے لوٹے تو احباب کی ضیافتِ طبع کی خاطر یہاں سے جو ارمغاں لے گئے تھے وہ یہ شعر تھا:

تم کہے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
بندہ پرور رات بھر اس غم میں ہم کھائے نہیں

اس نکتے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ غالبؔ جب کلکتہ آئے تو اس وقت وہ اخذ و جذب کے دور سے گذر چکے تھے۔ ان کا خون مغل تہذیب کا ساختہ و پرداختہ تھا۔ اس کی بافت میں پرکھوں کے تجربات و مشاہدات خوابیدہ تھے۔ شعور میں خاندانی فخامت اور ریاست کا تفاخر تھا۔ بچپن تعیش اور آزادہ روی میں گزرا تھا۔ مغل تہذیب کی روایت ایک طرف غالبؔ کے لاشعور کا حصہ تھی تو دوسری جانب سلطنت کا زوال روز افزوں تھا۔ اس زوال نے غالبؔ کو لاشعور کا اسیر بنا ڈالا تھا، اور وہ اس تہذیبی عظمت کے نقیب بن گئے تھے۔ ایسے میں کوئی بہت حاوی

تہذیبی قوت یا نفسی کیفیت پر اثر انداز ہونے والا واقعہ ہی کسی فکری اور حسی تبدیلی کا سبب بن سکتا تھا۔ کلکتے میں غالبؔ کو نہ تو کوئی حاوی تہذیبی قوت ملی اور نہ ہی ایسا کوئی واقعہ رونما ہوا جو غالبؔ کے ذہن کو بدل ڈالتا۔

البتہ ۱۸۴۷ء میں قیدِ فرنگ نے غالبؔ کی نفسی کیفیت کو اتھل پتھل کر ڈالا۔ اس قید نے غالبؔ کو اپنی نظروں میں گرا دیا۔ یہ قید ایک شاعر کی بے آبروئی نہ تھی۔ ملو کی تفاخر کی شکست تھی۔ خاندان فخامت کا ٹوٹنا تھا۔ اس قید کے سبب غالب خود کو ننگِ وجود تصور کرنے لگے۔ اس وقت شاعری کا فن غالبؔ کا سہارا بنا اور ایک بار پھر وہ اردو شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ اس نفس تبدیلی کا بھرپور اندازہ ۱۸۴۷ء کے بعد کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے[۷]۔ تاہم نفسی کیفیت کی یہ تبدیلی بھی کوئی بنیادی فکری تبدیلی نہ تھی، بلکہ اپنی ذات سے ایک نوع کی بیزاری تھی، جس کا اظہار اس دور کی شاعری میں تواتر کے ساتھ ہوا۔ فی الوقت یہ مسئلہ ضمناً در آیا ہے، اس لیے تفصیل کی گنجائش نہیں۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ قیامِ کلکتہ کے اثرات کی تلاش کو ابتداً ۱۸۴۶ء کی شاعری تک محدود رکھا گیا تھا۔

کلامِ غالبؔ کی اس نفسی کیفیت کے مطالعہ کے بعد بھی اگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کی شاعری پر قیامِ کلکتہ کے اثرات ہیں اور سفرِ کلکتہ غالب کی تخلیقی زندگی کے لیے ایک اہم موڑ ہے، تو ان اثرات کی واضح نشاندہی کی ذمہ داری بھی قبول کرنی ہوگی اور کلامِ غالب کے تقابلی اور تجزیاتی مطالعے سے اس رازِ نہاں کی عقدہ کشائی کرنی ہوگی۔ لیکن یہ تقریباً ناممکن سا ہے کہ بقولِ غالبؔ (تصرف کی معذرت کے ساتھ)

کب رشکِ عدم معرضِ اظہار میں آوے

حواشی وحوالے

۱۔ افضل بیگ جو خواجہ حاجی کا سالا تھا نے غالب کے متعلق یہ پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا کے غالب رافضی ہے اور قتیل کو برا بھلا کہتا ہے اہلِ کلکتہ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس پروپیگنڈا کی بنا پر قتیل کے شاگردوں نے غالب کی مخالفت پر کمر باندھی اور ان کے اشعار ہوئے۔

جزدے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم ہم چوں موئے کہ بتاں راز میان برخیزد

شور اشکے بفشارِ بنِ مژگاں دارم   طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفاں زدۂ

۲ـ نساخ نے ایک کتاب انتخاب نقص ترتیب دی جس میں لکھنوی چھ شاعروں کے کلام پر اعتراضات کیے گئے تھے۔اس کتاب کے جواب میں بیسوں کتابیں لکھی گئی۔اور بہت دنوں تک یہ معرکہ چلتارہا۔

۳ـ ''کلکتہ سرمایہ دارانہ تصورات کا منبع تھا اور کلکتہ سے باہر بنگال کے دوسرے علاقوں میں عوامی طبقاتی کشمکش غیر واضح شکل میں شروع ہو چکی تھی جو کبھی وہابی تحریک اثر لیتی تھی کبھی فرایضی تحریک سے کبھی ڈاکوؤں اور سنیاسیوں کی شکل میں رونما ہوتی تھی کبھی اور کبھی ٹھگی کے بھیس میں اور جس زمانے میں کلکتہ میں مقیم تھے اس وقت ان تحریکوں کا دور تھا...... کلکتہ کا سفر پنشن حاصل کرنے کی حیثیت سے مایوسی اور ناکامی کا سفر تھا لیکن نئے تجربات اور نئے شعور کی دولت اکٹھا کرنے کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوا۔اسی سفر نے انہیں اس نظام کی بربادی کا یقین دلایا جو بہت دنوں سے انحطاط اور تباہی کی طرف بہ سرعت جا رہا تھا،، غالب کا تفکر۔

۴ـ غالب جس وقت کلکتے آئے اس وقت کلکتے کی آب وہوا بہت خراب تھی۔ایک شاعر نے کلکتے کی آب وہوا کے بارے میں لکھا ہے

آب شور از زمیں سراسر شور   شور فرماں روائے کلکتہ

پارۂ از زمینِ دوزخ بود   کہ برآں شد بنائے کلکتہ

خارش و داد، پیچش و اسحال   ایں ہمہ تحفہ ہائے کلکتہ

ایک انگریز افسر سر جان لارنس جسے بعد میں لارڈ کے خطاب سے نوازا گیا نے بھی لکھا ہے''ناممکن ہے کہ کلکتہ کی ناقص آب وہوا میں بارہ مہینے رہ کر کام کیا جاسکے''۔مولانا آزاد نے کلکتے کے سبزہ زار ہائے نظرہ کی تعریف پر لکھا ہے کہ غالب ہر اس چیز کی تعریف کریں گے جو انگریزوں سے متعلق ہو۔

۵ـ مولانا آزاد غالب کے قصیدوں کے بارے میں لکھتے ہیں''وہ جو لکھتا تھا اس کا تخاطب خود بہادر شاہ نہ ہوتا تھا، بلکہ اس تختِ اعظم کی روح صولت وعظمت اس کے سامنے ہوتی تھی جس پر کبھی بیٹھ کر اکبر نے فیضی سے، عالمگیر نے عرفی وطالب سے اور جہاں گیر نے کلیم سے

مدحیہ قصیدے سنے تھے (مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام)

۶۔ قیدِ فرنگ کے بعد کہے جانے والے چند شاعر سے غالب کی نفسی کیفیت کی تبدیلی اندازہ لگائیے:

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا، دل سے جگر جدا ہے

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
کہوں کس میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں وہ گرمی کہاں سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
قاطعِ عمار ہیں اکثر نجوم وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی

میری قسمت میں اگر غم اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

عقیلؔ احمد عقیلؔ

مولوی آغا احمد علی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب

’’برہان قاطع‘‘، علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ فارسی زبان میں فارسی الفاظ کی ایک مضبوط فرہنگ ہے۔ یہ فرہنگ ۱۶۵۲ء میں سلطان عبد اللہ قطب شاہ کے دور حکومت میں بمقام گولکنڈہ مرتب ہوئی۔ اس کتاب کے مؤلف محمد حسین متخلص بہ برہان ابن خلف التبریزی تھے۔ ان کی جائے پیدائش معلوم نہیں وہ دکن میں سکونت پذیر تھے۔ یہ لغت اپنے زمانے تک کے سارے فارسی لغات میں سب سے ضخیم ہے۔ اس کی ترتیب الفبائی ہے۔ اس سے پہلے کی کسی لغت کی ترتیب اتنی محکم نہ تھی۔ اس میں الفاظ کے معنی ترتیب وار درج ہوئے ہیں۔ معنی کی ایسی تفصیل کسی اور فرہنگ میں موجود نہ تھی۔ الفاظ کے تلفظ بھی دئے گئے ہیں۔ یہ اپنی خصوصیت کی بنا پر فارسی زبان کی ایک اہم فرہنگ خیال کی جاتی ہے۔ (۱۸۰۰ء تک اس کے چار پانچ اڈیشن نکل چکے تھے) کپتان ٹامس رویک نے ۱۸۱۸ء میں بڑے اہتمام کے ساتھ برہان قاطع شائع کی جس میں انہوں نے بہ زبان انگریزی تمہید لکھی۔ کپتان ٹامس رویک فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں شعبۂ ہندوستانی میں مدرس ثانی اور عربی، فارسی، ہندی اور برج بھاشا کے ممتحن تھے۔ فارسی میں ان کو برہان قاطع سب سے زیادہ مبسوط، بہترین طور پر مرتب اور عموماً سب سے زیادہ مفید معلوم ہوئی۔ ان کے علاوہ

دیگر مستشرقین نے بھی حسین تبریزی کی برہان قاطع کو ایک مستند تالیف قرار دیا ہے۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے اغلاط سے پاک نہیں ہے۔ روبک کو برہان قاطع طالب علموں اور جویائے علم کے لیے اس قدر مفید نظر آئی کہ انہوں نے اس کے چھپوانے کا اہتمام شروع کر دیا۔ اس کے لیے مولوی کرم حسین بلگرامی میر منشی شعبۂ عربی و فارسی، مولوی حیدر علی بلگرامی ،حاجی محمد شفیع ،مولوی محمد اکبر عظیم آبادی، مولوی نظام الدین دہلوی، مولوی صادق علی الہ آبادی، مولوی کاظم علی نصیر آبادی ،مولوی غلام قادر آروی اور منشی امام علی خیر آبادی کی کوشش اور تعاون سے برہان قاطع کا ایک نیا اڈیشن ۱۸۱۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوا جس میں بیس پچیس فرہنگوں سے اس کی تصحیح کی گئی اور لارڈ وارن ہیسٹنگز کے نام منسوب کی گئی ۔ برہان قاطع کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ۱۶۵۲ء کی اس کتاب کی قدر و منزلت میں اب بھی کوئی کمی نہیں واقع ہوئی۔ حیات غالب' میں شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ ''۱۹۵۲ء میں سفر ایران کے دوران ہم نے دیکھا کہ اب برہان قاطع کی وہاں بڑی قدر ہے اس کے نئے نئے اڈیشن شائع ہو رہے ہیں اور غالب کی قاطع (قاطع برہان) سے ایران میں کوئی واقف نہیں۔''

(غالب کے عہد میں برہان قاطع کی شہرت عروج پر تھی ۔ علماء وفضلاء کی نگاہ میں اس کتاب کی بہت وقعت واہمیت تھی۔ غالب فارسی کے معاملے کسی کو اپنے سے بڑا یا بہتر نہیں تسلیم کرتے تھے۔ خسرو کے علاوہ دیگر تمام ہندوستانی فارسی دانوں کو اور شعراء وفضلاء کو بہ زعم خود بے اعتبار بتاتے ہیں۔ اہل زبان یعنی ایرانیوں کو تسلیم کرتے تھے۔ غالب کو برہان کے تبریزی اور فارسی زبان ہونے کے علاوہ فارسی داں ماننے سے بھی انکار تھا۔ 'برہان قاطع' کی مقبولیت غالب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی تھی ۔ برہان قاطع کے مؤلف محمد حسین تبریزی کا مذاق اڑانے میں غالب نے کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی ۔ مرزا رحیم بیگ کے نام ایک خط میں وہ حسین تبریزی کے خلاف اس قسم کے جملے تحریر کرتے ہیں۔

''خصوصاً'' دکن تو عجب جانا نہ ہے، لغو ہے، پوچ ہے، پاگل ہے، دیوانہ ہے، وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ہائے اصلی کیا ہے اور ہائے زائدہ کیا ہے۔'' (عود ہندی)

غالب نے یہ طے کر لیا تھا برہان قاطع کی غلطیوں کو ڈھونڈ کر نکالا جائے۔ عبدالغفور سرور کے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں ''جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق

ہے جمہور کو، ان کا حال کیا گزارش کروں، ایک ان میں صاحب برہان قاطع ہے۔ اب ان دنوں میں برہان قاطع کو دیکھ رہا ہوں اور اس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کر کے، اس نسخے کا نام ''قاطع برہان'' رکھوں گا۔۱۲ (عود ہندی)

فارسی دانی میں اپنی یکتائی کا رعب جمانے کے لیے ذرا ذرا سی بات پر فرہنگ نویسوں سے اظہار بیزاری کرنا اور ان کا مذاق اڑانا حتٰی کہ ان کے لیے فحش کلمات کا استعمال کرنا مرزا غالب کی عادت بن چکی تھی۔ ان کی انانیت، ہر حد سے متجاوز کر چکی تھی۔

غالب ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً گوشہ نشین ہو چکے تھے اور 'دستنبو' کی تصنیف و تالیف میں مصروف تھے تو انہیں حسین تبریزی کی برہان قاطع، کے مطالعے کا پورا موقع ملا۔ چنانچہ 'دستنبو' کی تکمیل کے بعد 'برہان قاطع' کے اغلاط کو ایک کتابی شکل میں جمع کر کے اس کا نام 'قاطع برہان' رکھا۔ 'قاطع برہان' کو ۱۸۶۲ میں مطبع نول کشور، لکھنؤ نے چھاپا۔ اس کا چھپنا تھا کہ غالب کے سامنے مخالفت کا سمندر امڈ پڑا۔ پورے ملک میں غالب کی اس تالیف کے خلاف ایک لہر دوڑ گئی اور اعتراضات و سوالات و جوابات کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جسے انیسویں صدی کا سب سے بڑا ادبی معرکہ سمجھا گیا۔ اور جو غالب کی موت پر ہی بند ہوا۔ بقول امتیاز علی خاں عرشی'' میرزا صاحب نے سنہ ۱۸۶۰ میں فارسی کی مشہور فرہنگ ''برہان قاطع'' کی اغلاط پر مشتمل ایک رسالہ ''قاطع برہان'' لکھ کر، نواب فردوس مکاں کی امداد سے شائع کیا تھا۔ اس کے جواب میں ہندوستان کے متعدد اہل علم نے رسائل لکھے۔''[۱۳]

سب سے پہلے اس کے جواب میں سید سعادت علی کی کتاب ''محرق قاطع برہان'' چھپی، اس کے جواب میں تین رسائل لکھے گئے اول دافع ہذیان' فارسی میں از نجف علی خان دوم ''لطائف غیبی'' از میاں داد خان سیّاح اور سوم ''سوالات عبد الکریم'' آخری دونوں اردو میں ہیں۔ اس کے بعد ساطع برہان از میرزا رحیم بیگ میرٹھی چھپی۔ اس کے جواب میں مرزا نے ایک خط نامۂ غالب کے نام سے لکھا۔ قاطِع برہان کے جواب میں دو کتابیں اور وجود میں آئیں قاطع القاطع از امین الدین دہلوی اور دوسری کتاب 'مؤید برہان' تھی جس کے مصنف آغا احمد علی اصفہانی تھے۔ آگے ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ

آئے گا۔اس کتاب کو دیکھنے سے قبل ہی غالب نے ۳۱/اشعار پر مشتمل ایک قطعہ 'نامۂ غالب' لکھ کر بھیج دیا تھا۔اور کتاب دیکھنے کے بعد مرزا نے ۳۲ صفحے کا ایک مختصر رسالہ اردو میں لکھا اور اس کا نام 'تیغ تیز' رکھا۔اس میں سترہ فصلیں ہیں پہلی سولہ فصلوں میں ایک ایک اعتراض آغا احمد علی پر کیا ہے۔آخری فصل میں برہان قاطع پر مزید اعتراضات ہیں۔اس پر عبدالصمد فدا سلہٹی نے 'تیغ تیز تر' لکھا۔ہنگامۂ دل آشوب دوم میں منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی نے ایک قطعہ لکھا جس سے آغا کی حمایت اور میرزا کی مخالفت مقصود تھی۔ان کا جواب ابھی تک نہیں ہوا تھا کہ آغا احمد علی نے شمشیر تیز تر'' لکھ دی اس کی اشاعت کے بعد غالب کی موت واقع ہوگئی اور یہ معرکہ یہیں پر ختم ہوا۔''مؤید برہان'' اور اس کے آغا احمد علی پر ہی گفتگو ہوگی کیونکہ اس میں مختصر سے مضمون کا موضوعِ بحث بھی یہی ہے۔

(آغا احمد علی اصفہانی کی معرکتہ الآرا تصنیف ''مؤید برہان'' جب مرزا غالب کی 'قاطع برہان' کی تردید میں کلکتہ سے شائع ہوئی تو کلکتہ میں غالب کے خلاف ایک زبردست لہر دوڑ گئی۔پوری فضا غالب مخالف ہوگئی جس سے غالب کی عملی شخصیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے۔یہ کتاب غالب کی 'قاطع برہان' کا ایک مدلل جواب ہوتے ہوئے بھی ادبی اہمیت کے اعتبار سے بھی اپنی انفرادیت اور اہلِ علم وتحقیق کی نگاہ میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔قاضی عبدالودود غالبیات کے ایک اہم ستون مانے جاتے ہیں انہوں نے بھی کھلے لفظوں میں ''مؤیدّ برہان'' کی قدر و منزلت کا اظہار کیا ہے۔

''مؤیدّ برہان'' بہترین کتاب ہے۔جو قاطع برہان، کے جواب میں لکھی گئی تھی''۔[۱۳]

بہر حال آغا احمد علی کی ''مؤید برہان'' اور ان کی دیگر تصانیف پر تبصرہ کرنے سے قبل ان کی مختصر سوانح پر ایک نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔آغا احمد علی کے والد کا نام آغا شجاعت علی تھا۔ان کا خاندان نادر شاہ کے زمانے میں اصفہان (ایران) سے ہندوستان آیا تھا۔اسی لیے خود کو اصفہانی لکھتے تھے۔آغا احمد علی کی پیدائش ۱۰/شوال الکرم ۱۲۵۵ھ میں ڈھاکہ میں ہوئی تھی۔کچھ لوگ ڈھاکہ کی پیدائش کی بنا پر جہانگیر نگری بھی لکھتے تھے۔عربی وفارسی پر دسترس حاصل تھی۔۱۸۶۲ء میں کلکتہ آئے یہاں انہوں نے ۱۸۶۲ میں ایک مدرسۂ

احمد یہ قائم کیا اور تا حیات اس کے صدر رہے اور ۱۸۶۴ء میں پروفیسر ای۔ بی۔ کویل E.B.Cowell کی شفارش پر انہیں کلکتہ کے گورنمنٹ مدرسۂ (موجودہ مدرسۂ عالیہ میں فارسی مدرس کی ملازمت ملی۔ پروفیسر کویل کلکتہ کے بارسوخ شخص تھے جو خود بھی ایک بڑے دانشور اور مفکر تھے۔ اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے علمی جریدے میں ان کی نگارشات چھپتی تھی۔ ساتھ ہی وہ ایشیاٹک سوسائٹی میں کئی سکریٹریوں میں سے ایک سکریٹری بھی تھے۔ مولوی آغا احمد علی کو فارسی ادب پر خصوصیت کے ساتھ عبور حاصل تھا۔ ان کی تصانیف میں ہفت آسمان، رسالہ، ترانہ، اشتقاق، مؤید برہان''' اور شمشیر تیز تر'' کے مطالعے سے ان کی فارسی دانی اور تحقیقی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آغا احمد علی کے شاگردوں میں مشہور مستشرق بلاک من بھی تھا جو ۱۸۵۸ میں کلکتہ آیا، ۱۸۶۰ میں مدرسہ کالج، کلکتہ میں بحیثیت ماتحت استاد مقرر رہوا۔ ۱۸۶۲ میں ملازمت ترک کردی، ۱۸۶۹ میں مدرسہ کالج کا چارج دیا گیا ۱۸۷۰ میں وہ پرنسپل مقرر کیا گیا اور اپنے انتقال یعنی ۱۸۷۸ تک وہ اس عہدے پر فائز رہا۔ وہ ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ۴۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا، کتبہ شناسی اور ہندوستان میں مسلم تاریخ کے مطالعے میں ان کی نگاہ بہت عمیق تھی۔ انہوں نے اپنے استاد آغا احمد علی کی تصنیف ہفت آسمان، میں سوانحی نوٹس بہ زبان انگریزی تحریر کیا ہے جس سے آغا احمد علی کی شخصیت اور صلاحیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سوانحی دیباچہ ہفت آسماں کے لیے یکم دسمبر ۱۸۷۳ء کو لکھا تھا۔ اب یہ کتاب کم یاب ہے۔ جس کی وجہ سے میں اس مضمون میں اس کو اصل شکل میں یعنی بزبان انگریزی نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ (بلاک من نے ۱۸۶۸ء میں ایک مقالہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں شائع کیا تھا جس کا عنوان contributions to parsion lexicography یعنی فارسی لغت نویسی کی خدمات تھا۔ اس مقالہ میں اس نے محمد حسین تبریزی کی کتاب 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' غالب کا جائزہ لیا ہے۔ بلاک من نے نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد منصفانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اظہار کیا ہے۔ ''برہان کے لغت کی وجہ سے ہندوستان میں خاصی بحث چل پڑی ہے۔ موجودہ دہے میں دہلی سے ایک کتاب چھپی ہے جس کے مؤلف اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ہیں۔ مؤلف

موجودہ ہندوستان کے بہترین فارسی نویس ہیں ان کی دیگر تخلیقات میں مکاتیب' دیوان اشعار اور ہندوستانی حکمرانوں کی تاریخ 'مہر نیم روز' شامل ہیں۔ انہوں نے غدر پر خالص فارسی میں 'دستنبو' کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی ہے غالب کی اس کتاب کا نام قاطع برہان ہے۔ اس میں انہوں نے برہان پر حملے کیے ہیں۔ اس اعتراض سے بحیثیت محقق ان کی شہرت کو خاصا نقصان پہونچا ہے۔ ساری کتاب میں غالب کا انداز دشنام سے بھرا ہوا ہے۔ بلکہ فحش ہے۔ کتاب میں ہر جگہ وہ برہان کو ''دکنی'' یا این مرد ''دکنی'' کہتے ہیں (غالب) برہان کو مستقل لغت نویس سمجھتے ہیں حالانکہ خود برہان دیباچے میں اپنے آپ کو ''فقیر جامع لغات و تابع ارباب لغت است نہ واضع'' کہہ کر متعارف کراتا ہے۔ اس پر غالب کے بیشتر اعتراضات فرہنگ (جہانگیری) یا فرہنگ (سروری) کے مطالعے کے بعد رفع ہو جاتے ہیں اس کتاب (قاطع برہان) میں جان بوجھ کر غلط بیانات پیش کیے گئے ہیں۔ (غالب) نے بعض الفاظ کے جو اشتقاقات بتائے ہیں وہ ہندوستانی نقطۂ نظر سے غیر تحقیقی ہیں۔ ڈھاکہ کے آغا علی احمد نے جو کلکتہ مدرسہ میں فارسی کے استاد ہیں، ان (غالب) کی خوب خبر لی ہے۔ ان کی جوابی کتابی کا نام ''مؤید برہان'' ہے۔ یہ کتاب دو سال قبل کلکتہ سے شائع ہو چکی ہے۔ مؤید کے مؤلف کے یہاں تنقیدی کج کاوی اور سائنسی صداقت نظر آتی ہے۔ جو ہندوستانی ادیبوں میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ بعض لغات مثلاً آتش، ایثار، بخش اور آذر وغیرہ کے سلسلے میں ان (آغا احمد علی) کی بحث قابل مطالعہ ہے۔ مؤلف نے حال ہی میں اپنی کتاب میں اشاریہ کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ بعد میں آنے والے لغت نویسوں کو اس کتاب کا ایک نسخہ رکھنے سے خاصا فائدہ ہوگا۔

اس جوابی کتاب (''مؤید برہان) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جن چار سو الفاظ پر اعتراض کیے ہیں ان میں سے تیس الفاظ کے بارے میں خود برہان نے غلطی کی ہے۔ دیگر الفاظ مشتبہ ہیں اور فرہنگ (جہانگیری) و سروری میں بھی کسی مشاہد کے بغیر درج کیے گئے ہیں۔ بعض اور غلطیوں کی نشاندہی سراج اللغتہ کے مؤلف (سراج الدین خان آرزو) نے بھی کی ہیں لیکن مجموعی طور پر خود برہان کی غلطیاں اتنی کم ہیں کہ بحیثیت ایک محتاط لغت نویس، ان کی شہرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ (برہان قاطع) کی بعض غلطیوں

کی تصحیح کپتان روبک cap.Roback نے اپنے مطبوعہ ایڈیشن کے حواشی میں کردی ہے

غالب نے ۱۸۶۷ میں 'تیغ تیز' کے عنوان سے (مؤید برہان) کا جواب لکھ کر غلطی کی۔انہوں نے خارج از بحث مسائل کو شامل کر کے بات ٹالنے کی کوشش کی ہے۔(غالب) نے اپنی کتاب کے آخر میں دہلی کے مختلف بااثر حضرات حتی کہ نوابین کی تصدیق اور مہر درج کی ہے۔کہ یہ حضرات بھی مجھ سے متفق ہیں۔آغا احمد علی کا جواب الجواب بہ عنوان ''شمشیر تیز تر'' ابھی زیر طبع ہے[16]

غالب نے ہندوستانی فرہنگ نگاروں سے بے طور پر جھگڑا مول لیا۔ان کے متعلق چار طرف سے اتنا برا بھلا کہنے سننے کے بعد بھی مرزا اپنی اس فطرت سے نہیں ہٹے اپنے شاگردوں سے اور دوستوں سے ہندوستانی فرہنگ نگاروں کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔مرزا کے اس عمل سے ان علمی شخصیت کو بہت زیادہ نقصان ہوا۔مرزا کے متعلق بڑے نقادوں کی یہ رائے ہے کہ مرزا میں وہ تحقیقی اور علمی صلاحیت نہیں موجود تھی جس کے ذریعے وہ برہان قاطع کا منصفانہ تجزیہ کر سکتے اور نقائص کی نشاندہی کرتے۔ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں غالب کی انانیت اور بے جا زعم خود علمی کارفرما ہے۔ماہر غالبیات اور عصر حاضر کے منبع علم وخرد پروفیسر نذیر احمد غالب کی تحقیقی اور ناقدانہ صلاحیت سے بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''مختصراً یہ کہ 'برہان قاطع' کے نقائص کی نشاندہی جن صلاحیتوں کا تقاضا کرتی تھیں، غالب میں وہ صلاحیتیں نہ تھیں''۔[18]

جو آغا احمد علی اصفہانی کی کتاب ''مؤید برہان'' ۱۸۶۵ء میں مظہر العجائب پریس، کلکتہ سے شائع ہوئی تھی جو ۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ریحانہ خاتون نے اپنے مضمون بعنوان ''برہان قاطع کے سلسلے کے علمی وادبی معرکے'' جو غالب نامہ نئی دہلی میں شائع ہوا ہے لکھتی ہیں ''انہوں (آغا احمد علی) نے فارسی زبان میں برہان قاطع کی تائید اور قاطع برہان کی تردید میں ایک کتاب ''مؤید برہان'' کے نام سے لکھی۔اس میں ۶۸ ۹۴ صفحات ہیں اور یہ ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۵ میں مظہر العجائب کلکتہ سے شائع ہوئی۔''[19] واضح طور پر اس میں ۶ صفحات کا اشارہ بھی ضمیمہ کے طور پر شامل ہے۔ایشیاٹک سوسائٹی میں ''مؤید برہان'' کا

مذکورہ نسخہ موجود ہے۔

ڈھیر سارے رسائل برہان قاطع کی حمایت میں چھپے۔ ہر طرف سے غالب ہدف تنقید بنے لیکن برہان کے خلاف بیان بازی میں کمی کے بجائے اور تیزی آتی گئی غالب نے برہان کے ساتھ ساتھ دیگر فرہنگ نویسوں کی بھی مشکلیں شروع کر دی۔ منشی کیول رام ہشیار سے اپنے ذہن و دل کا بخار نکالتے ہیں:

''جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں ،نام ان کے کہاں تک لوں، مشہور وغیر مشہور کچھ کم سو رسالے ہوں گے۔ان سب رسالوں کے جامع ہندی ہیں۔کوئی اہل زبان نہیں ہے۔اشعارِ اساتذۂ ایران کو مآخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے، بہ نسبت مقام ان لغات کے معنی لکھ دیے۔استنباطِ معنی کا مدار قیاس پر، یہ میں نہیں کہتا کہ قیاس ان کا سراسر غلط، میرا قول یہ ہے کہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط۔''

مرزا اس قدر بوکھلا گئے تھے کہ جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل آغا احمد علی کے علمی رسالے 'موید برہان' کے علاوہ کچھ ایسے رسائل بھی مرزا کے خلاف منظر عام پر آ گئے کہ جن کے پڑھنے کے بعد وہ پریشان ہو گئے۔ اعتراضات کے خطوط کا انبار لگ گیا۔اس کے باوجود بھی مرزا کا کس بل وہی رہا۔انداز اور سلوک میں جھکاؤ پن نہ آیا۔لہٰذا 'مؤید برہان' کے جواب میں مرزا نے 'تیغ تیز' لکھ ڈالی۔ آغا احمد علی سے مخاطب ہو کر کیا فرماتے ہیں ذرا غور کیجئے:

''مولوی احمد علی صاحب تم صورت پرست ہو،اور فرہنگ نگاروں کے قرار دیے ہوئے صورِ الفاظ کو مانتے ہو اب یہاں ایک صورت کے باب میں کہ صورت کے معنی میں کچھ تفاوت بھی ہے ،کیا ارشاد کرتے ہو؟ مولوی اور کیا ارشاد کرے گا؟ چونکہ مخالفتِ قولِ دکنی کو کفر جانتا ہے ،میری تکفیر کرے گا اور کافر کہے گا۔ پھر کہ بھائی جہاں اور برے برے خطاب دیئے ہیں

،کافر بھی کہہ لے ،میں تو اس حالت میں بھی مولوی کو مسلمان

کہے جاؤں گا۔"[21]

آخری جملے میں غالب کا انداز کچھ سلجھا ہوا ہے یا بدلا ہوا ہے۔ انکساری جھلک رہی ہے۔ تم مجھے جو کہو میں تمہیں برا نہیں کہوں گا۔ یہاں تک کہ تم مجھے کافر بھی کہو تو میں تمہیں مسلمان ہی کہوں گا۔ مگر غالب کے اصل تیور اور طرز تکلم کا پتہ لگانا ہو تو کوئی تیغ تیز یا قاطع برہان کا مطالعہ کرے۔ زیادہ نہیں صرف "تیغ تیز" کے شروع میں جو مختصر دیباچہ ہے اسے پڑھ لینا ہی کافی ہوگا غالب کے مزاج اور اسکی انانیت اور اس کے زعم خود اعتمادی وخود ستائی کو جاننے کے لیے۔ اس دیباچہ سے غالب کے خلاف لکھے گئے رسائل کے غالب کے دل ودماغ پر کیا اثرات مرتب ہوئے تھے اس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"اللہ جل شانہ" اپنے بندوں کو ورزش امور خیر کی توفیق دے، اچھا وہ بندہ جس و ظلم کی خو نہ ہو، اور ظالم کی انواع ہیں۔ اچھا ہے وہ بندہ جس کو ظلم کی خو نہ ہو، اور ظالم کی انواع ہیں، ازاں جملہ ایک سخن پروری ہے کہ اس کو ایمانی کہنا چاہیے، یعنی کیتمان حق اور اعلان یا باطل باصرار۔ اسد اللہ خان غالب کہتا ہے کہ میں نے خاص نظر با علانِ حق برہان قاطع کی عبارت کی سستی اور بیان کی غلطی اور اطنابِ ممل کو نکوہش میں ایک رسالہ لکھا، اور اس کا نام قاطع برہان اور درفش کاویانی رکھا۔ جب بعدِ انطباع وہ رسالہ مشتہر ہوا تو پہلے پہل اس مثل ہندی کے مطابق "دبیل نہ کودا، کودی گون" ایک مرد بے مغزل مُعوّج الذہن، نہ فارسی داں، نہ عربی خواں نہ میری نگارش کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی، محرّق قاطع اس کا نام رکھا، وہ نسخہ بھی مشہور ہوا۔ پھر ایک مرزا رحیم بیگ میرٹھ کے رہنے والے بروے کار آئے اور ایک تحریر مسمّٰی بہ ساطع برہان نکال لائے۔ مطالبِ مندرجہ لغو، بیشتر محرق قاطع کے مضامین منقول۔ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا۔ زیادہ اس طرف التفات کو تضیعِ علمی میں سے بعد صرف مقاصدِ نحو وصرف فارسیت کی اسی قدر رعایت منظور رکھی کہ فقیر کے بعض فقروں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھالیں، باقی سوائے عربی قشری اور فارسی مسروقہ کے وہ گالیاں دی ہیں، جو کنجڑے، بھٹیارے استعمال کرتے ہیں۔ کمال یہ کہ ان کا منطق فہدی، اور حضرت کی عبارت فارسی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کولی، جولاہے ان دنوں

میں علم تحصیل کر کے مہذب ہو گئے ہیں۔ عمامہ باندھے ہوئے پڑے پھرتے ہیں۔ فحش نہیں بولتے، خلاف اپنی قوم کے صاحب وقبلہ ان کا روز مرّہ ہے۔ یا رب میاں امین الدین کس بری قوم کے اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے، مدرّس بنے، مگر الفاظِ مستعملۂ قوم نہ چھوڑے؟ اگر میری طرف سے ازالۂ حیثیت کی نالش دائر ہو جاتی تو میاں پر کیسی بنتی؟ مگر میرے کبرِ نفس نے ازالۂ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔ ان کی تحریر ان کے پاجی پن پر سجل ہے، بہرِ ذرہ تا آفتاب، رابعیم، مدرس احمد علی صاحب عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر، فارسیت میں برابر، فحش و ناسزا گوئی میں کمتر، جتنے الفاظ توہین و تذلیل کے ہیں، وہ چن چن کر میرے واسطے صرف کیے، اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں، شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے، صاحب عزوشان ہے، عالی خاندان ہے، امدائے ہند، روسائے ہند، راجگان ہند سب اس کو جانتے ہیں، رئیس زادگانِ سرکارِ انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ خطاب ہے، گورنمنٹ کے دفتر میں خان صاحب، بسیار مہربانِ دوستان، القاب جس کو گورنمنٹ خان صاحب لکھتی ہیں، اور کولٹری اور کتا اور گدھا کیونکہ لکھوں، فی الحقیقت یہ تذلیل بفحوائے، ضرب الغلام اِہانۃ المولیٰ، گورنمنٹ بہادر کی توہین اور وضیع و شریف ہند کی مخالفت ہے، میرا کیا بگڑا، مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا، میں نے معلم، امین بیدیں کو شیطان کے حوالے کیا اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کر کے ان کے مطالبِ علمی کا جواب اپنے ذمہ لیا۔ اس نگارش کا نام ''تیغ تیز'' رکھوں گا اور بعد اتمام اس کو چھپواؤں نگا اور اگر، مرگ نے امان نہ دی تو خیر مصرع، ای بسا آرزو کہ خاک شدہ، اب یہاں سے آغاز فضول ہے، داد کا طالب، غالب[۲۲]۔ حیات میں غالب شیخ محمد اکرام کہتے ہیں کہ ۱۹۵۲ء میں سفر ایران کے دوران ہم نے دیکھا کہ اب برہان قاطع کی وہاں بڑی قدر ہے۔ اس کے نئے نئے اڈیشن شائع ہو رہے ہیں اور غالب کی قطع (قطع برہان) سے ایران میں کوئی واقف نہیں۔''

آغا احمد علی کی کتاب 'مؤید برہان'' کے متعلق بیشتر فارسی دانوں اور محققوں نے اچھی رائے قائم کی ہیں، قاضی عبدالودود ایک جگہ لکھتے ہیں ''غالب کی قاطع برہان'' کے رد میں جو کتابیں ان کے معاصرین نے لکھی تھیں ان میں سب سے زیادہ قابلِ اعتنا

'مؤید برہان' مصنفہ آغا احمد علی تھی۔ غالب نے اس کا جواب 'تیغ تیز' کے نام سے لکھا، اور آغا احمد علی کے جواب الجواب کا نام شمشیر تیز تر ہے۔'' ۲۲

''شمشیر تیز تر'' ۱۸۶۸ء میں بسعی عبداللہ خاں مطبع نبوی، ''مولوی غلام نبی خان'' میں چھپا تھا۔ اس کی ضخامت ۱۰۶ صفحہ ہے۔ صفحہ ۲ تا ۱۵ میں غالب، عبدالصمد، فدا شاگرد احمد علی، باقر علی باقر، فخرالدین حسین سخن تلامذۂ غالب کے قطعات اور فدا کی طرف سے باقر و سخن کے قطعوں کا جواب بطور قطعہ ہے۔ یہ سب قطعات ایک ہی زمین میں ہیں۔ اس کتاب پر قاطعِ برہان کی معرکہ آرائیاں ختم ہوگئیں۔ یہاں ایک بات اور قابل غور ہے کہ دو ماہرین قاضی عبدالودود اور مالک رام کی تحقیق کے مطابق ''شمشیر تیز تر'' غالب کے انتقال کے بعد منظر عام پر آئی ہے۔ غالب ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ مالک رام لکھتے ہیں۔ اگر چہ (غالب) بہت دن سے مختلف امراض کا شکار تھے لیکن موت سے چند دن پہلے غشی کے دورے پڑنے لگے تھے، ۱۴ر فروری ۱۸۶۹ء دو پہر کو بیہوش ہوگئے۔ تشخیص ہوئی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ اسی حالت میں اگلے دن دو پہر ڈھلے ایک آسمان علم و ادب پیوند زمیں ہوگیا۔

آغا احمد علی کے بارے عام نقادوں کی رائے ہے کہ وہ غالب کا حریف تھا۔ حالانکہ یہ بات کسی حد تک درست نہیں ہے۔ آغا احمد علی اور غالب کے درمیان علمی مباحث اور معاملۂ سوال و جواب تھے مگر آغا احمد علی نے غالب کی قابلیت اور استادی کا لوہا بھی مانا اور اسے ایک مسلم استاد جتایا ہے۔ آغا احمد علی نے اپنی تصنیف 'ہفت آسمان'' میں غالب کا جو ترجمہ پیش کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ ہفت آسمان' مثنویات کی تاریخ ہے۔ اس کتاب میں سات ابواب ہیں جن میں سے احمد علی نے صرف پہلا باب مکمل کیا تھا۔ ۳۵ سال کی کم عمری میں انتقال کر گئے اور ان کا وہ کام جس میں صنف مثنوی پر مکمل تنقید اور مثنوی کی ساتوں بحروں کی تفصیل شامل تھی نامکمل رہ گئی۔ ہفت آسمان کے پہلے باب میں ان مثنویں کا ترجمہ ہے جو بحر سریع مطوی موقوف (مفتعلن مفتعلن فاعلن) میں لکھی گئی ہیں۔ یہاں غالب کی مثنوی درد و داغ کا ذکر کرتے ہوئے احمد علی نے مرزا غالب کا مختصر ترجمہ بھی شامل کیا ہے۔ جو درج ذیل ہے:

''(۷۲)وبرین وزن است مثنوی درد و داغ غالب؛ نام اور اسد اللہ خان۔تخلص غالب۔اوخودش گفتہ

بیت:

غالبؔ، نام آورم نام و نشانم مُپرس
ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد الٰلّٰہیم

عرف مرزانوشہ۔اکبرآبادی المولد دہلوی المسکن ،شاگرد میرزاعبدالصمد اصفہانی کہ بیشتر ہرمزد نام داشتہ۔قوت طبع وقدرتِ سخن گزاری نظمہا ونثرہا مسراوراسلم است بلکہ بیشتر نثراو دل رباتر،لیکن حال سخندانیِ او سیما کیفیتِ قاطع برہان اوکہ پستر درفش کاویانی خطابش کردہ، و جوہرِ تیغِ تیز اواز مطالعۂ جوابہای آن خصوصاً مؤید برہا، وشمشیر تیز تر، برتماشائیان سخن حالیت۔درلارنس گزٹ ،میرٹھ،مطبوعہ ۲۶ رفروری سنہ۱۸۶۲ انوشتہ عمراوتخمینا ہشتادودوسال بودہ است۔مولوی عبدالحکیم جوش تخلص مدرسِ اسکول میرٹھ،تاریخِ وفات اوکہ درسنہ

یکہزاردوصدہشتادوپنج۔واقعہ شدہ چنین یافتہ

ع:''مردہیہات میرزانوشہ''

اماشمس الملک مظفرالدین خاں بہادرمظفر جنگ فرماید:

سال میلادِاوست لفظ''غریب''
سال فوتش''بمردغالبؔ آہ''

پس عمراوہفتاوسہ باشد''[۲۴])

آغا احمد علی نے عبدالحکیم جوش کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے''مرد ہیہات میرزا نوشہ'' جس کی رو سے غالب کی وفات ایک ہزار دوصد وہشتاد وپنج میں واقع ہوئی لیکن خود اس مصرعہ سے ۱۲۸۴ برآمد ہوتا ہے یعنی سال وفات سے ایک سال کم۔احمد علی نے مظفر جنگ کا ایک شعر نقل کیا ہے یعنی

سال میلاد اوست لفظ''غریب''
سال فوتش ''بمرد غالب آہ''

جس کے پہلے مصرعہ میں سال ولادت کے لیے لفظ ''غریب'' ۱۲۱۲ھ ہے اور دوسرے مصرعے میں ''بمرد غالب آہ'' سے ۱۲۸۵ نکلتا ہے جو غالب کی سنہ وفات ہے۔

(ہفت آسمان میں مندرجہ بالا غالب کا ترجمہ کم ہی لوگوں کی نظر سے گزرا ہوگا۔)

مولوی آغا احمد علی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں مصحح تھے۔ اور سکندر نامۂ بحری یا اقبال نامۂ سکندری مصنفہ نظامی، اقبال نامۂ جہانگیری، منتخب التواریخ مصنفہ عبد القادر بدایونی، مآثر عالمگیری اور اکبر نامہ مصنفہ ابوالفضل (۲ جزو) جیسی معرکتہ الآرا کتابوں کو ایڈٹ کیا۔ احمد علی کا ایک رسالۂ ترانہ ہے جسے بلاک من نے تالیف کر کے ایک سال بعد ۱۸۶۷ میں شائع کیا۔ یہ کتاب فارسی رباعیات پر ہے۔ ان کی ایک اور اشتقاق ہے۔ جو فارسی گرامر سے متعلق ہے۔ بلاک من نے اسے ایک بہترین کتاب بتایا ہے۔

۳۵ سال کی عمر میں آغا احمد علی ۶ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ مطابق جون ۱۸۷۳ء کو بخار میں مبتلا ہو کر ڈھاکہ میں انتقال فرما گئے۔ ہجری تاریخ کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر چونتیس برس چار مہینے بیس دن تھی۔

آغا احمد علی کی موت سے فارسی زبان و ادب میں علمی و تحقیقی مطالعہ کو زبردست نقصان پہونچا جس کی تلافی آج تک نہیں ہو سکی۔ اس پائے کا محقق اور عالم صدیوں میں پیدا ہوتا ہے بلاک من کا کہنا ہے کہ ان کے شاگردوں نے جن میں خود بلاک من شامل ہیں ایک شفیق استاد کھو دیا اور ایشیاٹک سوسائٹی ایک محنت کش عالم اور باشعور مصحح سے محروم ہو گئی جس کا بدل ملنا بہت مشکل ہے[۲۵]

حواشی

۱۔ سعادت علی صدیقی۔ فروغ اردو، لکھنؤ غالب نمبر ۱۹۶۹ء

۲۔ ایضاً

۳۔ غالب ص ۱۰۶

۴۔ نقش آزاد، ص ۲۷۳

۵۔ مجموعہ دہلی اور غالبؔ، از قاضی عبدالودود۔ سہ ماہی 'اردو' کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹

۶۔ (عودی ہندی ص ۳۱)

۷۔ فروغ اردو' غالب نمبر' ۱۹۶۹

۸۔ غالب ص ۱۲۲۰ غلام رسول مہر

۹۔ غالب نامہ' غالب انسٹی ٹیوٹ' دہلی جولائی ۲۰۰۳ء ص ۸۹

۱۰۔ پروفیسر نذیر احمد، نقد قاطع برہان' غالب انسٹی ٹیوٹ' نئی دہلی' ۱۹۸۵ ص ۲۷۱

۱۱۔ بحوالہ شریف حسین قاسمی، غالب نامہ، جولائی ۲۰۰۳ء ص ۱۰۴۔

۱۲۔ بحوالہ ایضاً ص ۹۱

۱۳۔ امتیاز علی خاں عرشی مکاتیب غالب' رامپور' ۱۹۴۳ء ص ۱۴۱ (مصنف ناظم کتاب خانہ ریاست رامپور تھے)'

۱۴۔ نقد غالب'' قاضی عبدالودود۔

۱۵۔ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ جو بہت خستہ حال ہے۔

P-B-1-no:۲۵

۱۶۔ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ ج ۳۷، ۱۸۶۸ جز واول ص ۱۹، ۲۰

۱۷۔ غالب نامہ، ج ۲ رشمارہ ۲ (جولائی ۱۹۸۱) ضمیمہ ص ۲

۱۸۔ ایضاً ج جولائی ۱۹۹۸ء ص ۲۰۷

۱۹۔ بحوالہ شریف حسین قاسمی، غالب نامہ جولائی ۲۰۰۳ء ص ۱۰۱

۲۰۔ تیغ تیز، قاطع برہان، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۶۷ صفحہ ۲۶۴ تا ۲۶۵

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ قاضی عبدالودود کچھ غالب کے بارے میں حصہ دوم، پٹنہ ۱۹۹۵ ص ۳۹۵

۲۳۔ ہفت آسمان، آسمان اوّل۔ از مولوی آغا احمد علی۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۷۳، کلکتہ۔ ص ۱۶۶۔ ۱۶۷

۲۴۔ ایضاً (انگریزی مقدمہ)

مرزا غالب اور آغا محمد حسین ناخدا شیرازی

مرزا غالب کا سفر کلکتہ، اصل مقصد کے لحاظ سے کامیاب نہیں رہا، لیکن اس کے دور رس نتائج ضرور نکلے۔ کچھ تلخ و زہرناک، کچھ خوشگوار و حلاوت بخش۔ جو مرزا کی شخصیت کے رنگا رنگ پہلوؤں کے ابھارنے نکھارنے میں ناقابل انکار عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں کے نکتہ چینوں کی یاد جہاں مرزا کو مدۃ العمر کچو کے لگاتی رہی اور مرزا کو وقتاً فوقتاً خیالی تخلیقات کے بلند جھروکے سے اتار کر خشک بحث و تحقیق کے خارزار میں طے منازل کرنے پر مجبور کرتی رہی وہاں کچھ مخلصین کی بے لوث محبت بھی مرزا کو میسر آئی۔ جن کی قدر شناسی کے طفیل مرزا کے حوصلے بلند رہے۔ نواب علی اکبر خان طباطبائی و مولوی سراج الدین احمد جیسے کرم فرماؤں کا پر خلوص اعتماد مرزا کے لیے باعث افتخار رہا۔ لیکن اسی سفر میں کئی ایک ایرانی الاصل احباب سے بھی مرزا کو روشناس ہونے کا موقع ملا جو مرزا کے جوہر قابلیت وحسن مذاق کے قائل نکلے۔ ان ایرانیوں سے مرزا کے تعلقات پر بالعموم زیادہ توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ ان میں سے ایک آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی کا نام مرزا کے فارسی مکاتیب اور اردو مکاتیب میں ملتا ہے اور کلکتہ سے مرزا کی مراجعت کے بعد ابھی ان کا قلم اس نام کو فراموش نہیں کرتا۔

''متفرقات غالب'' اور ''مآثر غالب'' دو نادر مکاتیب کے مجموعے جن کی بازیافت واشاعت کا سہرا اعلیٰ الترتیب پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور قاضی عبدالودود کے سر بندھتا ہے ان میں جا بجا آغا محمد حسین شیرازی کا ذکر لفظ ''ناخدا'' کے بغیر آتا ہے جبکہ مشہور مجموعۂ مکاتیب فارسی (پنج آہنگ) میں مرزا کا ایک خط بجواب آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی درج ہے ۔ یہ مکتوب بقول ڈاکٹر مختار الدین احمد ۱۸۶۵ میں کبھی لکھا گیا۔ مرزا نے ناخدائے شیرازی کے خط اور اپنے جواب کا تذکرہ اپنے معروف شاگرد غلام حسین قدر بلگرامی کے نام اپنے ایک مکتوب میں کرتے ہوئے اپنے مرسلہ جواب کی نقل بھی بھیجی ہے مرزا کا اصل خط بنام قدر بلگرامی مع اس جوابی خط کی نقل کے ذخیرۂ حبیب گنج (مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں محفوظ ہے لیکن ناخدائے شیرازی کے اصل مکتوب پارس کی نقل کا سراغ نہیں ملتا۔ بہر حال مرزا نے قدر کو یوں تحریر فرمایا ہے:

'ہاں صاحب: آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی کا خط مع اشعار آیا، اور میں نے اس کا جواب بھجوایا اب جو ڈھونڈا تو میرا مسودہ ہات آیا، مگر آغا کا خط نہ آیا۔ اس مسودے کو صاف کر کے تمہارے پاس بھیجتا ہوں آغا صاحب کا خط جب نکل آوے گا وہ بھی بھجوا دیا جائے گا۔''

(دیکھیے: مختار الدین احمد ''مشمولہ'' علی گڑھ میگزین (غالب نمبر ۱۹۶۹، ص ۳۸)

مرزا نے جس مسودے کی نقل قدر کو بھیجی وہ ''پنج آہنگ'' میں شامل ہے۔

''آغا محمد حسین شیرازی'' اور آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی'' دو الگ الگ شخص تھے یا ایک ہی شخص کا ذکر مرزا نے ''متفرقات غالب'' اور مآثر غالب'' میں بدون لفظ (ناخدا) اور پنج آہنگ کے مندرجہ خط میں باضافہ لفظ (ناخدا) کیا؟ اس سوال کا جواب ڈاکٹر مختار الدین نے بالفاظ درج ذیل تحریر کیا ہے کہ:

''یہ آغا محمد حسین، اُن آغا محمد حسین سے مختلف ہیں جن کا ذکر متفرقات غالب (ادیب رضوی (رامپور ۱۹۴۷) ص ۷، ۳۵، ۷۷، ۸۵، ۸۶، ۸۷) اور مآثر غالب (قاضی

عبدالودود (علی گڑھ میگزین (غالب نمبر مرتبہ مختار الدین احمد) ۲۱) کے خطوط میں ہے۔ یہ کلکتہ میں اپنی والدہ (خانم صاحبہ) کے ساتھ رہتے تھے، یہ "ہنری املاک" کے متوسلین میں تھے اور غالب سے کلکتہ میں گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ مگر دہلی واپسی کے بعد انہیں اندیشہ تھا کہ افضل بیگ نے (جن کے بارے میں غالب نے لکھا ہے کہ اپنے خواہر زادوں یعنی اولاد مرزا حاجی سے رشوت لے کر ان کے ہمدرد ہو گئے ہیں اور غالب کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں) انہیں بھی نہ ملا لیا ہو (آثار غالب (علی گڑھ میگزین) ۱۹۶۹، ص ۳۸)

'آغا محمد حسین شیرازی' وہ ہیں جن کا ذکر غالب کے اردو خطوط میں کم از کم ایک جگہ ضرور ملتا ہے۔ وہ مرزا علاء الدین خاں علائی کو لکھتے ہیں: کل شام کو مخدوم مکرم جناب آغا محمد حسین صاحب شیرازی، بہ سواری ریل مانند دولت دل خواہ کہ ناگاہ آوے، فقیر کے تکیے پر تشریف لائے۔ شب کو جناب ڈپٹی ولایت حسین خاں کے مکان میں آرام فرمایا، اب وہاں آئے ہیں قریب طلوع آفتاب بہ چشم نیم باز یہ رقعہ تمہارے نام لکھا ہے جو کچھ جی چاہتا ہے وہ مفصل نہیں لکھ سکتا۔ مختصر مفید، آغا صاحب کو دیکھ کر یوں سمجھنا کہ میرا بوڑھا چچا غالب جوان ہو کر، میلے کی سیر کو حاضر ہوا ہے۔ بس نور چشمان راحت جان باقر علی خان و حسین علی خان ...... جناب آغا صاحب کا قدم بوس بجا لائیں اور ان کی خدمت گذاری کو اپنی سعادت اور میری خوشنودی سمجھیں، بس (مہیش پرشاد، خطوط غالب (الہ آباد ۱۹۴۱) ص ۳۷۰ / راقم ۵۲) نیز (علی گڑھ میگزین ۱۹۶۹، ۳۹)

یعنی قدر کے خط میں جس محمد حسین کا ذکر ملتا ہے وہ ناخدائے شیرازی ہیں۔ پنج آہنگ کا مکتوب بھی انہیں کو بھیجا گیا تھا کہ دونوں ماخذوں میں نام کے ساتھ (ناخدای شیرازی) کا لاحقہ موجود ہے۔ لیکن "متفرقات غالب" اور "مآثر غالب" میں جس آغا محمد حسین شیرازی کا ذکر ہے اور جس کی بابت مرزا نے علائی کو تحریری ہدایتیں دی ہیں وہ (ناخدا) کا لاحقہ نہیں رکھتا لہٰذا اس کی شخصیت الگ قرار دی جائے اور (ناخدائے شیرازی)

کی شخصیت الگ الگ اگرچہ نام دونوں کا مشترک ہے بادی النظر میں اس کی تائید کا پہلو مرزا کے درج ذیل فقرہ سے نکلتا ہے:

''آغا صاحب کو دیکھ کر یوں سمجھنا کہ میرا بوڑھا چچا غالب جوان ہو کر میلے کی سیر کو حاضر ہوا ہے''۔

ہمارے خیال میں اس فقرہ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ یہاں شیرازی مذکور کو جوان قرار دینا مرزا کی ظرافت ہے امر واقعی کا اظہار نہیں۔

''پنج آہنگ'' کے جوابی خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا سے (ناخدائے شیرازی) کی یہ مراسلت جب ہوئی اس وقت تک مرزا کی تصنیف (قاطع برہان) کی طباعت واشاعت (۱۸۶۲ء) تو ہو ہی چکی تھی، اس کے جواب میں سعادت علی کی (محرق قاطع برہان) بھی چھپ چکی تھی۔ اس کے بعد ہی ۱۸۶۴ یا ۱۸۶۵ء میں کبھی (ناخدائے شیرازی) کا توصیفی خط مرزا کو موصول ہوا۔ خط پڑھ کر مرزا جھوم جھوم اٹھے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قلم سنبھالتے سنبھالتے مرزا نے قطعۂ ذیل آغاز جواب میں موزوں فرما دیا:

نخل بند حدیقۂ تحقیق آبیار گل ونہال وگیاہ
(ناخدائے) سفینۂ معنی آں (محمد حسین) والا جاہ
سوے من ناگرفتہ روی آورد بسرم گل ز نامہ زد ناگاہ
رندی وراستی شعار منست مومنم لا الٰہ الا اللہ
بستودن اگرچہ شادم کرد من ہماں ناکسم سخن کوتاہ
منکہ می رنجم ازنگہ کہ مرا درنظر نیست غیر روز سیاہ
دیزہ در آرزوے دیدن اوست کہ نگہداشتم بدیدہ نگاہ

(پنج آہنگ (نول کشور ۱۲۸ء ۲۵۱، ص)

اس میں شک نہیں کہ (ناخدائے شیرازی) کا نام (محمد حسین) تھا مرزا کی وفات (۱۸۶۹ء) سے لگ بھگ چار پانچ سال پہلے ۱۸۶۴ء کے اواخر یا ۱۸۶۵ کے اوائل میں اس کی طرف سے تازہ مراسلت کا ثبوت خود مرزا نے فراہم کر دیا ہے۔ پھر مرزا کی وفات کے بعد ۱۸۷۵ء تک اس کا کلکتہ میں زندہ وسلامت رہنا یقینی ہے جس کی نشاندہی جلد ہوا چاہتی ہے۔

کلکتہ سے آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی کا تعلق بقید سنین وشہور کب سے شروع ہوا اس کا صریح جواب پیش کرنا سردست ممکن نہیں لیکن جیسا کہ اقتباسات منقولۂ بالا سے ظاہر ہے شیرازی سے راست تعلق مرزا کا بزمان قیام کلکتہ قائم ہو چکا تھا۔ دوسری طرف ۱۲۹۲ھ ہجری مطابق ۱۸۷۵ء تک کلکتہ میں (ناخدائے شیرازی) کا بقید حیات رہنا ثبوت کو پہنچتا ہے۔

دلیل ہماری یہ ہے کہ امام باڑہ ہوگلی کے متولی ششم مولوی کرامت علی جونپوری کی وفات دہم ماہ ستمبر ۱۸۷۵ء (شعبان ۱۲۹۲ھ) کو واقع ہوئی ان کی جگہ پر مولوی اشرف الدین احمد شرافت الدولہ کا تقرر بہ حیثیت متولی ہفتم باقاعدہ کیا گیا۔ اس موقع پر خاصہ جشن منایا گیا تھا، کلکتہ وہوگلی کے شعراء نے ۵۲ قطعات تاریخی اور ۳۳ تہنیتی قطعات وقصائد پیش کیے تھے ان میں سے بعض ''دردانۂ خیال'' میں اور کئی ایک 'طبقات محسنیہ'' میں درج ہیں۔ زمرۂ شعراء میں ذیل کے دو ایرانی نام بھی ملتے ہیں:

۱۔ آقای محمد حسین شیرازی ناخدا۔ ان کا پیش کردہ قطعۂ تہنیت دردانۂ خیال اور طبقات محسنیہ'' دونوں میں شامل ہے اس کے علاوہ ایک طویل قصیدہ (۵۹) ابیات پر مشتمل صرف طبقات محسنیہ (ص ص ۴۴۔۴۹) میں ملتا ہے۔

۲۔ آقای محمد حسین کربلائی متخلص بلبل کوچک۔ ان کا قصیدہ طبقات محسنیہ (ص ص ۴۲۔۴۳) کی زینت ہے۔ ناخدای شیرازی کا قصیدہ جو ''طبقات محسنیہ'' میں ثبت ہے خود شاعر کے سلسلہ میں اہم سوانحی وثیقہ کی حیثیت رکھتا ہے مضمون تشبیب کے بعد اصل ممدوح شرافت الدولہ کی مدحت سرائی کے ساتھ ان کے والد نواب فخر الملک وزیر سلطان سید محمد امیر علی خان بہادر (متوفی ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) کی منقبت بیان کی گئی ہے اس تمہید کے ساتھ شاعر نے جو مدعا بیان کیا ہے وہ اس کے ذاتی کوائف واحوال کا آئینہ دار ہے۔ نواب سید امیر علی خان بہادر، معزول

بادشاہ اودھ سلطان جان عالم واجد علی شاہ کے وزیر
ومدارالمہام(۱) تھے اور خود شرافت الدولہ سلطان کے زمرۂ
مصاحبین میں بوظیفۂ یکصد روپیہ سالانہ ۱۸۷۰ء سے منسلک
تھے۔

'ناخدا' نے شرافت الدولہ کی توجہ خاص کے ذریعہ وزیر سلطان کی عنایت مشفقانہ کی طلب گاری کی تھی کہ ان کی سعی وسفارش سے سلطان واجد علی شاہ کی اعانت انقلاب روزگار سے دوچار ہونے والے شاعر (ناخدای شیرازی) کو حاصل ہو اور اس طرح ناخدا کی کشتی مراد ساحل عافیت سے آ لگے۔

قصیدہ کا درج ذیل انتخاب لائق اعتناء ہے، ملاحظہ فرمایئے:

مہے کہ سروری از چہر اوست تابندہ	جو آفتاب کہ تابد زبرج فروردیں
مہینہ اشرف الدین احمد افتخار ملوک	محیط عالم نفس ومحاط عقل متیں
وزیر ومیر و امیر و مشیر شاہ اود	کہ قدر جاہش برتر بود زآں تکیں[؟]
امیر علی مشرف دودمان آل علی	امیر علی گہر مجر عترت یسیں
بزی بظل عنایات او چنانکہ زید	بظل حضرت سلطاں وزیر باتمکیں
مراست مسألتی از تو اے سپہر کرم	کہ نزد حضرت باب از کرم کنی تلقیں
کہ مطلبی کہ ورا عرض کردہ ام زنخست	زبہر تربیت خود بنزد حامی دیں
خدیوں واجد علی شاہ، بادشاہ اود	نبیرۂ خرد و پور عقل وباب یقیں
زسراہ لطف سر انجام آں مہم سازد	مرارہا نداز کثرت حنین وأنیں
چرا کہ سیل ارم[۱] چوں زجای برخیزد	ہزار رخنہ کند در بنائے حصن حصیں
مراست سیل ارم[۲] انز جار طبع دژم	کہ گشتہ از حرکات سپہر زار وحزیں
چہ عز مرد بمال است وعز مال ببذل	زفیض بذل مرابے نصیب گشتہ یمیں
کفی کہ بذل ندارد بنزد اہل خرد	فسردہ باد چودست چنار درتشریں
چہار سال شدائے فخر دودۂ آصف	کہ رفتہ حاصل سی سالہ ام زکد یمیں

چناں بدیدۂ دونان بے بصر خوارم — کہ تخم حنظل در کام خفتہ در تجبین
لبسے زمانہ شدائے عندلیب بزم سخن — کہ لطف بیحد را داں مرانمودہ رہین
بسامدیحہ سرودم بخورد، خورد و بزرگ — ولی نیا فتم از ہیچ سروری تحسین
ہزار بیت فزوں در بمدح شاہ اود — سروردم ونشدم کام طبع زاں شیریں

منقولہ، بالا ابیات سے معلوم ہوا کہ ۱۸۷۵ء سے چار سال پہلے ،ناخدا کو سخت مفلوک الحالی سے سابقہ پڑا تھا اس کی سی سالہ ثروت و دولت ہاتھ سے جاتی رہی اس کے عروج و زوال کی کہانی گذشتہ ۳۴ سال کی طویل مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔ لہٰذا سرزمین کلکتہ سے اس کا تعلق ۱۸۴۱ سے قطعی طور پر ثبوت کو پہنچ جاتا ہے ہمارے پاس کوئی معمولی قرینہ بھی ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد پر ۱۸۴۱ کو ناخدای شیرازی کے ورود کلکتہ کا نقطۂ آغاز قرار دینا لازمی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ۱۸۴۱ سے ۱۸۷۵ تک اس کی بود و باش کی مرکزی حیثیت جو کلکتہ کو حاصل رہی اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ کلکتہ جیسے ابھرتے ہوئے مرکز سے ،ناخدائے شیرازی کی آمدورفت کا سلسلہ ۱۸۴۱ء سے بھی پہلے شروع ہونا جان لیا جائے البتہ کم عمری کے باعث وہ اپنی والدہ اور اور دوسرے سرپرستوں کی نگرانی میں رہا پھر وہ اپنے پاؤں پر ۱۸۴۱ تک کھڑا ہو پایا اور جب سے تین دہائیاں خاصہ ترقیات کے حصول میں گزاریں اور ایک عرصۂ طولانی اس نے فارغ البالی سے بسر کیا ویسے تفصیل اس کی نہیں ملتی لیکن قصہ جس دور کا ہے اس میں تجارت و ناخدائی کی باگ ڈور سواحل عرب اور خلیج فارس سے کلکتہ تک عربوں اور ایرانیوں کے ہاتھوں میں ایک حد تک ضرور تھی۔ شیخ احمد شروانی کا کتاب ''العجب العجاب'' اور دوسرے مراجع سے ہمارے اس دعوی کی خاصہ تصدیق ہوتی ہے۔ ناخدا کا تخلص بھی ہمارے خیال میں تنہا شاعری کی خاطر اختیار نہیں کیا گیا بلکہ مشغلۂ ناخدائی، کا غماز بھی ہے۔

ناخدای شیرازی کا کوئی معاصر ہمنام و ہموطن جو کلکتہ میں مقیم رہا ہو اس کا امکان ہے تو مسلم۔ لیکن کلکتہ کے مقامی مراجع کے ذریعہ ہمیں تنہا خدائے شیرازی ہی کے بارے، میں مذکورۂ بالا معلومات کی یافت میں کامیابی حاصل ہوتی ہے علاوہ برایں خود مرزا کے خطوط میں واضح اشارے یا شواہد اس بات کے نہیں ہیں کہ محمد حسین شیرازی کو ناخدا شیرازی سے الگ قرار دینا ناگریز ہو جائے۔ یا کم از کم امکان پر مبنی قرار دیا جا سکے۔

ڈاکٹر مختار الدین کی تحریر منقولۂ بالا میں (یہ) کا مشار الیہ درج ذیل خصوصیات کا مالک تھا کہ:

ا۔ کلکتہ میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا

۲۔ ہنری املاک کے متوسلین میں تھا

جبکہ (اُن) کا مشار الہ وہ شخص ہے جس کا ذکر متفرقات غالب'' اور مأثر غالب'' میں آتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ''مأثر غالب'' نہیں ہے ''متفرقات غالب'' (طبع دوم) البتہ موجود ہے۔ اس کے رجوع کرنے پر ظاہر ہوتا ہے کہ محمد حسین شیرازی بھی ہنری املاک کے متوسلین میں تھا مرزا نے مولوی سراج الدین احمد کے نام خط میں رقم فرمایا ہے:

''حال جامہ گذاشتن کرنیل املاک صاحب پیش از ورودگرامی نامہ بہ زبان یکے از صاحبان والا شان شنودم برائے مخدومی مرزا ابوالقاسم خان و مشفقی آقا محمد حسین صاحب سخت غمیں بودہ ام خدا کند در وصیت نامہ امرے مندرج باشد کہ بزائے ایں صاحبان کفایت کند''۔

مکرر ایک خط میں ذیل کا فقرہ ملتا ہے:

''دیگر ایں کہ یکے از صاحبان والا شان می گفت: کہ کرنل املاک صاحب از جہان رفت۔ وائے برحال مرزا ابوالقاسم خان و آغا محمد حسین''۔

''متفرقات'' کے خطوط میں کہیں بھی ''شیرازی'' کی نسبت نہیں ملتی۔ بہرحال منقولۂ بالا فقروں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آقا محمد حسین کو گہری وابستگی کرنل املاک سے تھی۔ نیز اس وابستگی کے لحاظ سے ابوالقاسم خاں بھی آقا محمد حسین کے شریک وسہیم تھے۔ یعنی کرنل املاک کے متوسلین میں ناخدای شیرازی، کسی خصوصیت کے تنہا مالک نہیں تھے۔ ان تمام امور مذکورہ کے پیش نظر متفرقات غالب و مآثر غالب کا آغا محمد حسین اور پنج آہنگ کا آقا محمد حسین ناخدائے شیرازی دو الگ الگ شخص نہیں بلکہ ایک ہی شخص ہیں۔

حوالہ:

(۱) دیکھیے مولانا شرر، ''جان عالم'' (ناشر نیوتاج آفس، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۴۹، دہلی) ص ص ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۵۰، ۵۱، ۵۳-۵۴

(۲) آل تکین: سمرقند کے بادشاہوں کا خاندان گذرا ہے۔ نیز بقول محمد مقیم نویسر کانی: بوزن کمین اسم بادشاہے است مشہور (فرہنگ جعفری، تہران ۱۳۶۲) ص ۱۳۳

(۳)۔(۲) بہر دو مقام الف سے لکھا ہے لیکن درست (عرم) مجرف 'عین' ہے

(۴) اصل مطبوعہ نسخہ میں (خارم) چھپا ہے جو درست نہیں

(۵) اشعار منقولہ کے لیے دیکھیے: طبقات محسنہ' ص ص ۴۴-۴۹

خواجہ نسیم اختر

غالبؔ اور وحشتؔ ـ تقلید اور اجتہاد کے تناظر میں

ادبی اور علمی شخصیتیں نہ صرف تاریخ کی پیداوار ہوتی ہیں بلکہ آفرید گار بھی ہوتی ہیں۔ان کی تعمیر وتشکیل اور ترتیب وتہذیب میں جہاں ایک طرف سماجی ،تہذیبی ،ثقافتی اور معاشرتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہاں نسلی اور نفسیاتی محرکات وتحریکات بھی ایک بامعنی رول ادا کرتے ہیں۔بعض ان میں اپنے عہد کی سچّی مخلوق ہونے کے ساتھ ساتھ جہاں تازہ اور عہدِ نو کے 'آئین ساز' کا منصب بھی پالیتی ہیں۔گویا ان کے حیطۂ شاہدہ اور دائرہ فکر میں ماضی ،حال اور مستقبل کی طنابیں کھینچ آتی ہیں اور اس طرح اکائی کی تشکیل ہوتی ہے۔جس کی وساطت سے یہ شخصتیں فکرونظر کے لیے سامانِ نشاط فراہم کرتی ہیں اور نئے اقداری نظام کی نمود کا باعث بھی ہوتی ہیں۔یہ بات کافی مشہور ہے اور قرین صداقت بھی کہ زمانہ نابغہ یا جینئس پیدا کرنے میں بڑے بخل سے کام لیتا ہے۔نابغہ نہ صرف پچھلی ادبی ،تہذیبی اور ثقافتی روایات یا ورثے کا امین ہوتا ہے بلکہ گاہے بگاہے ان روایات پر تاکیدی نشان بھی لگاتا ہے اور اس کی ازسرنو تفہیمات کے لیے ایک نیا رویہ بھی خلق کرتا ہے۔کیونکہ وہ مجتہد ہوتا ہے۔اس لیے وہ روایات کے بیمار عناصر کو الگ کر کے زندہ اور حیات بخش اجزا کو اپنے اندر

جذب کرتا ہے اور نئے انضمامات کے حوالے سے اسے ایک نئی تشکیل وصورت دے کر آنے
والے زمانے کے لیے قابلِ قبول بناتا ہے۔ جسے کاپ 'TRADENTALISM' یعنی کہ
ماورائیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ فلوبیئر کہتا ہے کہ کسی شاعر کی عظمت یا بڑائی کی دلیل یہ نہیں ہے
کہ اس نے اپنے وقت کے کتنے مسائل حل کیے بلکہ زمانے کو اس سے توقع یہ ہوتی ہے کہ
اس نے کتنے سوالات اُٹھائے اور اپنے دور کے متداول اعقائد اور نظریات پر شک وشبہ کی
نگاہ ڈالی ہے کہ نہیں۔

غالب کی شخصیت اردو کی شعری روایت کے تناظر میں فلوبیئر کے اس خیال کی ایک
روشن تعبیر ہے۔ غالب ان خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کی شعریات سے افہام وتفہیم کا
سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے شعری سروکار کے سلسلے میں جو انتقادی رویہ
ہمیں نظر آتا ہے وہ دراصل دو متوازی خطوط پر گامزن ہے۔ اکابرین کا ایک طبقہ رقیق القلبی اور
جذباتی ثروت مندی کے باعث ان کی بوطیقا کو ایک طرف الہامی، یا کوئی آسمانی صحیفہ، قرار
دینے پر مصر ہے تو دوسرا طبقہ ان کے شعری اکتسابات کو مہمل، مجہول، ناقص، بعید از فہم، ژولیدہ
بیانی، ایمال نگاری یا پھر ظلمت پسندی کا پلندہ قرار دینا چاہتا ہے۔ گویا کہ غالب کی شعریات
کے سلسلے میں ہمارے ادبی مطالبات، دو انتہاؤں کے درمیان سرگرم سفر ہے شیخ محمد اکرام نے
عرصہ ہوا لکھا تھا کہ "اردو تنقید کی عظمت اور سطحیت کا اندازہ لگانا ہو تو غالب پر لکھے گئے مضامین کا
مطالعہ کیا جائے۔" میں نے غالب کو خوش نصیب شاعروں کی صف میں اس لئے رکھا کہ
غالب اردو زبان کا واحد شاعر ہے جن کے صحیفہ فن کے گرد آج بھی صاحبانِ بصیرت زیادہ سے
زیادہ تعداد میں جمع ہوتے جارہے ہیں اور اس طرح ان کے شعری سرمائے کو 'کلچر' کرنے کی
ایک روایت قائم ہوتی چلی جارہی ہے۔ غالب کی شاعرانہ عظمتوں طرفین آج زیادہ مکمل رہی
ہیں اور عصری صفویت کے ساتھ نہ صرف نیک ہو رہی ہیں بلکہ ان کی شعری امتیازات کی
سرحدیں دور تک پھیل چکی ہیں۔ آج کا عہد غالب اور خود کو ایک ہی wave-length پر خود
محسوس کر رہا ہے۔ ان کی بوطیقا میں حسن عمل کے ساتھ ساتھ حسن خیال کا سلیقہ بھی ملتا ہے۔ اپنی
دو طرز ہائے فکر و عمل نے انہیں حیات و کائنات کی ایک خاص فہم اور نئے تصوّرات کو انگیز کرنے
اور اس کی بامعنی تشکیلات کے لیے ایک خاص تہذیب بھی بخشی تھی۔

جہاں تک غالبؔ کے قدما کے اشعار کی روشنی میں شعر کہنے کا سوال ہے یا اتباع کا معاملہ ہے تو اس کا چلن اردو کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں میں بھی رہا ہے۔ لیکن دیکھنا صرف یہ ہے کہ کیا وہ اس تقلید یا اتباع میں کامیاب ہوئے یا ناکام۔ ہمارے یہاں میر کی مثال موجود ہے کہ انہوں بھی جو قدما کے اشعار کہے ہیں بقول فاروقی ''کہ میر نے بعض اوقات پرانے شاعروں کا براہ راست 'ترجمہ کر دیا ہے'۔ غالب نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ غالب کے ہاں Echo بازگشت کی کیفیت ہے جبکہ میر کا استفادہ اکثر براہ راست' اگر چہ تخلیقی ہے۔''

میرا سروکار صرف اس بات سے ہے کہ اگر کسی شاعر نے اپنے پیش رو کے خیال کو لیا ہے تو اس خیال کو آگے بڑھایا ہے کہ نہیں۔ ورنہ کسی بھی بڑے شاعر کو یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنے قدمآ کے اشعار سے متاثر ہو کر اس کی روشنی میں شعر تو ضرور کہے لیکن اس میں اجتہادی شان نظر نہ آئے۔ یا پیدا نہ کر سکے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ غالبؔ نے اگر چہ ابتدائی دنوں میں یہ طرز اختیار کیا لیکن انہوں نے قدماً کے خیالات کو ارتعاع بخشا ہے کہ نہیں؟ نئی معنویت کا ایک تازہ جہان روشن کیا ہے کہ نہیں؟ معنیات کی سرحدوں کو پھیلایا ہے کہ نہیں؟ غالب کے ان اشعار سے جب میں نے ادبی رفاقت قائم کی مجھ پر یہ راز کھلا کہ غالبؔ نے نہ صرف اپنے منفرد اندازِ بیان اور اسلوبیاتی تشکیل کے حوالے سے بلکہ لفظوں کے دروبست، ڈرامائی عناصر، علوئے تخلیق، فکری تعمق کے وسیلے سے ان خیالات و مضامین کو دو چند کر دیا۔ ہے۔ ان مضامین کے دامن میں جمالیاتی سکّے ٹانک دیئے ہیں لہٰذا یہ اشعار نہ صرف زبان زد خاص و عام ہیں بلکہ دلدادگانِ ادب کے لیے اس میں بصیرت کا خاص سامان موجود ہے۔ بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ یہ اشعار قدماً کے اشعار سے بڑھ گئے ہیں۔ میں چند اشعار یہاں نقل کرنا چاہوں گا جس سے آپ بھی اندازہ لگا لیں گے کہ یہ باتیں حقائق پر محمول ہیں یا صرف ذہنی یکہ تازی سے عبارت ہیں

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا
(ناسخ)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں
(غالب)

کون کہتا ہے کہ غیروں کی تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو کبھو یاد کرو
(میر)

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
(غالب)

کہا تھا ہم نے بہت بولنا نہیں ہے خوب
ہمارے یار سو اب ہمیں سے بات نہ چیت
(میر)

میں نے کیا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں
(غالب)

ہوا ہوں شکل سے اپنی کہ اس قدر بیزار
کہ شاق ہوتا ہے مجھے دیکھنا آئینہ کا
(سودا)

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں
(غالب)

غالب کے یہ اشعار اثر و تاثیر اور اندازِ بیان کی ندرت اور تازگی کی وجہ سے اوریجنل ماخذ سے آگے نکل گئے ہیں۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب نے اپنی اجتہادی کاوشوں سے ان خیالات کو ترفع بخشا ہے۔ غالب نے نہ صرف اپنے

زمانے کے متداولہ موضوعات سے انحراف کیا بلکہ انہوں نے نئے استعارے اور نئے لوازمات بھی پیش کیے۔ لہٰذا ان کی باغیانہ طبیعت اور ان کے تخلیقی سروکار کی تفہیم کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ان کی شعری کائنات کے مرکزی فکری رویوں سے بھی مکالمہ قائم کریں کیونکہ اس مخصوص صورتحال کے بغیر جس نے غالبؔ کو اپنے وجود کی بنیاد ڈھونڈنے اور حقائق کی نئی تعبیر و تفسیر پر مجبور کیا۔ غالبؔ کے شعری کمالات کی پہنچ ذرا مشکل ہے۔ غالب کا دراصل تصورِ حقیقت ماورائی اور مابعد الطبعیاتی ہے۔ اور یہی غالبؔ کے منطقی ادراک کا بنیادی پتھر بھی ہے ان کے ہاں منطقی ادراک کے باعث استفہامیہ انداز پیدا ہوتا ہے۔ وہ خدا کائنات اور انسان کے سلسلے میں نیز انسانوں کے رابطوں اور معاملات کے بارے میں بعض بنیادی سوالات بھی اٹھاتے ہیں۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ وہ محض سوالات قائم کرتے ہیں بلکہ قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان کے جوابات خود ان کے کلام میں پہلے سے موجود ہیں۔

غالب کے سوچنے اور شعر کہنے کی روش اور ان کا اندازِ بیاں گویا کہ ان کا پورا فکری نظام ان کے معاصرین اور ان کے عہد کے مروّجہ آداب و اصول سے بہت مختلف ہے اور اس کا سبب تھا ان کی عمیق بصیرتیں، ان کا ہمہ گیر ادراک اور نگاہِ دوررس برصغیر کا وہ نیا تہذیبی دھارا جس کی نمود ۱۹ ویں صدی کی دوسری دہائی تک واضح ہو چکی تھی۔ انہیں کس طرف جانا چاہیے اور آئندہ کسی کے کیا امکانات و اثرات ہونگے اس کے بارے میں غالبؔ بہت پہلے فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ چکے تھے ان کی غیر معمولی بصیرت اور ژرف بینی کے منور نشانات ان کی شاعری اور نثر میں کئی جگہ وضوح انگیز ہیں۔ اس فکری روایت سے انہیں علیحدہ کر کے دیکھنا یا ان کی شعریات کا تجزیہ و احتسابؔ کرنا دراصل انہیں اصل سیاق و سباق سے الگ کرنا ہے اور اس طرح کی کوئی بھی کوشش غالبؔ کے شعری اکتسابات کے عظیم الشان پہلوؤں سے صرف نظر کرنا ہوگا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ نظام فکر انہیں ورثے میں ملا تھا یہ وہی نظام فکر ہے جو اردو اور فارسی کی بوطیقا میں پہلے سے موجود ہے۔ لیکن غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف فکری ورثے سے اپنی شاعری کی عمارت تعمیر کی بلکہ اپنے فکری نظام کو نئے تخیلی اور جمالیاتی دریافتوں سے ہمکنار بھی کیا۔ اور نئے منطقوں کی بازیافت بھی۔

غالب جیسے نابغہ شاعر کی اتباع کسی حد تک تو کی جا سکتی ہے لیکن کوئی شاعر اپنی شعری کاوشوں کا قابل لحاظ حصہ غالب کے رنگ کی پیروی میں صرف کرے تو اسے مایوسی ہاتھ لگے گی۔ وحشت کے ساتھ یہی المیہ پیش آیا۔ یوں تو تخلیقی سروکار کی رو سے یہ طرزِ عمل بھی خلافِ فطرت ہے کیونکہ، موضوعات لفظیات علائم اور ترکیب سے استفادہ تو کیا جا سکتا ہے اور ممکن ہے اس میں کسی تک حد کامیابی بھی نصیب ہو جائے لیکن شعری کوائف جو شاعر کے داخلی نظام سے وابستہ ہوتے ہیں اس کی تقلید ایک ناکام کوشش پر فتح کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا کہ غالب نے قدما کے اشعار پر اشعار کہے ہیں لیکن انہوں نے آنکھ موند کر پیروی نہیں کی اور انہیں اپنی پوری شاعری کو اس طرزِ عمل کی نذر کر دیا اور نہ ہی انہوں نے میر درد بننے یا کسی اور شاعر کے رنگ میں پورے طور پر ڈوبنے کی کوشش کی لیکن وحشت نے غالب دوراں بننے کے چکر میں نہ صرف اپنی بہترین صلاحیتوں کا خون کیا بلکہ وہ خود اپنی ذات سے ایک حوالہ بن سکتے تھے اس نکتہ کو بھی انہوں نے فراموش کر دیا۔ وحشت بنگال میں زمزمہ پرداز تھے، بنگال یورپ کے نشاۃ الثانیہ کا سلسلہ ہائے عمل تھا بنگال میں مغربی افکار و تجربات، انگریزی زبان کی وساطت سے باڑھ کی صورت پھیل رہے تھے۔ نئی تحریکیں پھوٹ رہی تھیں۔ انقلابی اقدار اور نئے فکری رویے نئے زاویے اور نئے ابھار سے محفوظ ہو رہے تھے بنگال کا ہر فرد سیاسی اور سماجی طور پر خود کو فعال محسوس کر رہا تھا۔ فکر و نظر میں ایک انقلاب رونما ہو رہا تھا سیاسی ادارے نکل رہے تھے فرنگیوں سے آزادی کے لیے کوششیں تیز تر ہونے لگی تھیں۔ دوسری طرف یورپ میں پہلی جنگ عظیم انسانی اقدار اور مرّوجہ ایقانات پر شب خون مار رہی تھی۔ علوم و فنون میں غیر معمولی ترقی اور تبدیلی نے انسان کے یقین کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور نئے انداز سے ایک نئی سوچ پر نکل پڑتی تھی جس کے نتیجے میں ایک نئی "sensitivity" اُبھر کر سامنے آنے لگی جس کا بالغ ادراک و اظہار بنگلہ شعر و ادب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ صرف بنگال میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ایک نیا وزن نیا سماجی و سیاسی شعور اور تازہ تہذیبی اور ثقافتی افقیں اپنے پاؤں پھیلا رہی تھیں۔ لیکن آخر وہ کیا وجوہات تھیں کہ وحشت کی شاعری ان تبدیلیوں سے تہی داماں رہی۔ اس نئی حقیقت کی کوئی چاپ نہ کوئی سیر نہ کوئی نشانِ قدم ملتا ہے۔ وحشت کو ان کے عہد کے کچھ اکابرین کے حوصلہ افزا خطوط نے بھی گمراہ کیا ان اکابرین نے وحشت کو غالبِ دوراں بننے

پر نہ صرف مبارک باد دی بلکہ اُن کی کاوشوں کی سراہنا بھی کی۔ جبکہ یہ بدیہی حقیقت ہے کہ ہر فنکار شخصی افتادِ طبع، شخصی وجدان اور شخصی بصیرت لے کر دنیا میں آیا ہے۔ ورنہ ایک ہی عہد کے کئی شاعر ایک ہی طرح کے معاشرے، ماحول اور تہذیبی روایت کی پیداوار ہونے کے باوجود فکر و نظر اور اندازِ بیان کی سطح پر ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں، وحشت جبکہ ایک ذہین اور قادرالکلام شاعر تھے۔ مبدأ فیاض نے انہیں بھرپور تخلیقی استعداد سے نوازا تھا اس کے باوجود انہوں نے اپنی شاعری کا معتد بہ حصہ غالب کے اتباع میں صرف کیا۔

میں دو شاعروں کے درمیان موازنہ یا مقابلہ کا کبھی قائل نہیں رہا۔ کیونکہ ہر شاعر اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کے شعری امتیازات ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں کہیں کہیں قدر مشترک کی کیفیت ضرور ملتی ہے لیکن کئی زاویوں سے ایک دوسرے سے متمائز اور متغائر ہوتے ہیں۔ غالبؔ اور وحشتؔ دو مختلف زمانوں کی پیداوار تھے، دونوں کے عہد کی حسیّت جدا جدا تھی۔ جو لوگ وحشتؔ کے کل کارنامے اور ان کی شاعرانہ عظمت کی بنیاد غالبؔ دوراں ہونے سے عبارت سمجھتے ہیں ان کے حضور میں غالب اور وحشتؔ کا ایک ایک شعر نقل کرنا چاہونگا اور اس سے ثابت کرنا کا میرا مقصد یہ ہے کہ کسی بڑے شاعر کی شعری نگارشات سے اکتسابِ فیض تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے رنگ میں اپنے شعری سرمائے کے قابل لحاظ حصّہ کو داؤ پر لگانا اپنی بصیرت کے ساتھ نہ صرف ناانصافی ہے بلکہ ایسی تخلیقی صلاحیتوں کے متعلق ایک طرح سے اپنی بے اعتمادی کو بھی ظاہر کرنا ہے۔ اس صورتحال کو درجہ ذیل دو شعروں کے حوالے سے بہ آسان سمجھا جا سکتا ہے

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
(غالب)

دلِ دیوانہ کرتا ہے در و دیوار سے باتیں
میری خلوت نہیں ہے یہ تو محفل ہوتی جاتی ہے
(وحشت)

غالبؔ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آدمی بذات خود مختلف خیالات کا ایک ہجوم ہے۔ اگر وہ تنہا

بھی رہنا چاہے تو اس کا تنہا رہنا ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کا ذہن اپنے دائرہ اثر میں نوع بہ نوع خیالات تصورات کا ایک ہنگامہ برپا کیے رہتا ہے۔ فاروقی نے اس شعر سے متعلق کئی اہم نکات اُٹھائے ہیں۔ ''لفظ محشر' کا تخلیقی استعمال ہوا ہے۔ محشر کے معنی برانگیخت کرنا اور 'محشر' کے معنی قیامت کے دن مردوں کے اکٹھا ہونے یعنی زندہ ہونے کی جگہ ہے۔ لہٰذا اس لفظ میں معنی کی تین شقیں ہیں (۱) برانگیخت کرنا (۲) مردوں کا زندہ ہونا (۳) لوگوں کا ایک جگہ جمع ہونا۔ لفظ آدمی توجہ طلب ہے۔ غالب نے آدمی کو بھی میسّر نہیں انسان ہونا، کہہ کر آدمی اور انسان میں فرق پیدا کیا ہے اور یہ فرق ان کے ذہن میں رہا ہوگا۔ آدمی کی تخصیص کر کے انہوں نے تمام بنی نوع آدم مراد لیے ہیں۔ انسان کہتے تو ممکن تھا۔ آدمی کا بہترین اور مخصوص شکل یعنی انسان کی طرف تخصیص ہو جاتی ہے اور عمومیت جاتی رہتی مراد یہ ہے کہ تمام آدمیوں کی سرشت ایسی ہے کہ ان کے ذہن میں خیالات برانگیخت ہونے لگتے ہیں۔'' آپ نے دیکھا شعر میں گنجینۂ معنی کا طلسم کس طرح روبہ عمل آیا ہے۔ غالب کا یہ شعر نہ صرف رمزیاتی اور معنیاتی انسلاکات کا ایک خوب صورت امتزاج ہے بلکہ یہ شعر ان کے مخصوص طرزِ ادا اور انداز بیان کا ایک خوب صورت اشاریہ بھی ہے۔

وحشت کا شعر دیکھیے۔ شاعر صاحب جنوں کی فطرت کو بیان کرتا ہے کہ در و دیوار سے باتیں کرتا ہے اور در و دیوار سے باتیں کر کے انہوں نے یہ تلازمہ مراد لیا ہے۔ اس وجہ سے ان کے یہاں خلوت میں جلوت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کی کیفیت سے نہ دیوانگی کے بامعنی تلازمے ابھرتے ہیں اور نہ ہی تنہائی کا احساس قطعی زائل ہوتا ہے۔ غالب کے شعر میں تہہ داریاں لفظوں کے مخصوص استعمال سے پیدا ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ابلاغی امکانات کے حدود وسیع ہو گئے ہیں۔ میرا صرف یہ کہنا ہے کہ اگر وحشت اپنی افتادِ طبع اور اپنی مخصوص بصیرت سے شروع ہو کر شعر کہتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ شعر اچھا بھی ہوتا اور اثر و تاثیر میں اضافے کا سبب بھی ہوتا اور معنیات کی جہتیں بھی ہماری توجہ مبذول کراتیں۔ سید لطیف الرحمٰن اپنی کتاب نسّاخ سے وحشت تک میں رقمطراز ہیں۔

> ''غالب کی تقلید کا جذبہ وحشت صاحب کے اندر فطری طور پر تھا۔ اس فطری جذبے کے تحت انہوں نے غالب کی تقلید میں

ایک عمر بسر کی اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ غالب اور
وحشت کا کلام اگر ساتھ ساتھ پڑھا جائے تو دونوں میں نمایاں
فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وحشت صاحب کا کلام غالب کے کلام
کی طرح شگفتہ، پُر تاثیر اور پُر سوز نہیں"۔

اس اقتباس کا اگر آپ تجزیہ کریں تو دو قسم کے تضادات سامنے آتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ان کا یہ کہنا کہ غالب کے اتباع میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئے اور پھر دوسری سانس میں یہ کہنا کہ دونوں کے کلام کو ساتھ ساتھ پڑھا جائے تو کلام میں جو شگفتگی اور سوز و گداز ہے اس سے وحشت کا کلام محروم ہے۔ پر صرف یہ کہنا ہے کہ اس قسم کی تقلید۔ وحشت کے کلام کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے کا نتیجہ ہے۔

ایک اہم بات جو وحشت اور غالب دونوں سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ کہ غالب نے اپنے قدما کی ابتدائی دنوں میں تقلید کی لیکن ان کے ساتھ قدرت نے اتنا کرم کیا کہ انہیں بروقت اس طرزِ عمل سے باز رہنے میں مدد فرمائی ورنہ ممکن تھا وہ بھی اس راہ میں بہت دور جا نکلتے اور ان کی شاعری نہ صرف کمالات بلکہ اجتہادات سے بھی متصف نہ ہو پاتی۔ جب لوگوں نے غالب کو یہ احساس دلایا کہ "ایں راہ تر کستان می رود" تو انہوں نے غالب اور اردو شاعری دونوں پر احسانِ عظیم کیا اور اسی بروقت ادبی مشورے کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ۲۴ سال کی عمر تک کے اپنے کلام کے بیشتر حصّہ کو اپنے دیوان سے حذف کر دیا اور صرف نمونے کے طور پر چند غزلیں رہنے دیں۔ غالب نے یہ کہہ کر اپنا دامن بچایا کہ طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے۔

لیکن وحشت کا المیہ ہے کہ انہیں اپنے شعری سفر کے کسی اہم موڑ پر یہ احساس نہ ہوسکا کہ انہیں خود اردو کی شعری روایت میں ایک ریفرنس بننا ہے۔

اور ان پر یہ نکتہ کسی وجہ سے واشگاف نہ ہوسکا کہ عظمت تو انفرادیت کے بطون سے پیدا ہوتی ہے۔ غالب کو شیفتہ اور آزردہ جیسے ذہین احباب ملے جن کی صحبت نے بس غالب کو فائدہ پہنچایا جبکہ وحشت کے احباب اور تلامذہ کا حلقہ اپنے زمانہ حدود سے آگے دیکھنے کی صفاتِ جمیلہ سے متصف نہ تھا اور نہ ہی وہ اتنے بصیر تھے کہ وحشت کو اسی طرز سے باز رکھنے کی کوشش

کرتے۔

غالبؔ اور وحشتؔ کے چند اشعار یہاں نقل کرنا چاہوں گا۔ تاکہ صاحبانِ نظر دونوں کے شعری امتیازات کو بخوبی سمجھ سکیں۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ سے بھی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
غالبؔ

دیدۂ یار سے جب تک نہ ٹپکے آنسو
ہم کو تسلیم نہیں چشم کا گریاں ہونا
وحشتؔ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
وحشتؔ

مجبور ہم ہیں اور فرشتوں کو دیکھیے
فہرست لکھ رہے ہیں عذاب وثواب کی

وحشتؔ نے غالبؔ کے مضامین کو آگے بڑھانا تو دوران اشعار کی ڈرامائیت اور دامنِ خیال میں انقباضِ پیدا کردیا۔

لیکن وحشتؔ دیوانِ وحشتؔ کے بجائے 'ترانہ' وحشت کے حوالے سے بالکل مختلف اور منفرد شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی فطری بصیرت۔ جودتِ طبع، ندرت احساس اور سفر گل بیان درج ذیل اشعار میں پوری عظمت کے ساتھ وضوح انگیز ہیں۔

چند شعر ملاحظہ کریں۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

دلیل پستیِ ہمت ہماری ظاہر ہے
شکایت ستم روزگار کرتے ہیں

پابندیِ رسوم کو سمجھا ہے زندگی
زنار چھینیں لینگے ابھی برہمن سے ہم

غارت سے پہلے ہم نے چمن میں لگادی آگ
صد شکر ہے دبے نہیں جورِ خزاں سے ہم

مجالِ ترک محبت نہ اک بار ہوئی
خیال ترک محبت تو بار بار آیا

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

کاش! وحشتؔ اس طرح کے اشعار جو ان کی فنی ہنر مندی۔ اور تخلیقی رفعت کا زائیدہ ہیں، زیادہ تعداد میں کہہ پاتے تو مشرقی ہندوستان اردو کی شعری روایت کو ایک اور جُنبش دے سکتا۔ وحشتؔ کو آخری دنوں میں اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ غالبِ دوراں بننے کی آرزو اور للک میں انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ ضائع کر دیا۔ ان کا یہ شعر خود ان کے اس کربناک احساس کی ترجمانی کرتا ہے آپ بھی اسے سن لیجئے۔

بدلا ہوا مذاقِ سخن ہے زمانے کا
مجہول غزل ہے وحشتِ رنگیں نوا عبث

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہُوں